اسلام کے بنیادی عقائد

پہلا حصہ

مؤلف

حجۃ الاسلام سید مجتبیٰ موسوی لاری

مترجم

حجۃ الاسلام مولانا روشن علی

نام کتاب: ——— اسلام کے بنیادی عقائد

مصنف: ——— حجۃ الاسلام سید مجتبیٰ موسوی لاری

ترجمہ: ——— حجۃ الاسلام مولانا روشن علی

خطاطی: ——— سید قلبی حسین رضوی کشمیری

ناشر: ——— دفتر گسترش فرہنگ اسلامی

تعداد: ——— ۳۰۰۰ (تین ہزار)

تاریخ: ——— شوال ۱۴۰۸ھ

چھاپ ——— اوّل

فہرست

- حرفِ مترجم ۵

بحث معرفتِ خدا ۷

- خدا کی معرفت ۹
- وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز۔ ۱۸
- خدا اور تجرباتی علوم کی منطق۔ ۳۱
- وجودِ نادیدہ کا عقیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے۔ ۴۱
- اصل علیت۔ ۴۶
- اصالت نیروی حیات۔ ۵۴
- فطرت میں خدا کے جلوے۔ ۵۸
- مادہ و قوانین وجود۔ ۶۴
- دو طرفہ توازن۔ ۶۵
- علم طب کا کارنامہ۔ ۶۸
- طبیعت کی ظرافت کاریاں۔ ۷۰
- موجود مطلق کا تصور۔ ۷۴
- خدا علت سے بے نیاز ہے۔ ۷۷

- ہر موجود محتاج علت ہے۔ ۸۱
- مسئلۂ علل کا تتبع۔ ۸۳
- عالم حادث ہے۔ ۸۶
- انسان کی بے بسی اور محدودیت۔ ۹۱
- علمی دھوکہ بازی۔ ۹۳
- بے دینی کے اسباب۔ ۱۰۰
- خدا کے صفات اور خصائص۔ ۱۱۳
- آئیڈیل خدا کے شرائط۔ ۱۲۳
- دعا شاکرین کی بہترین علامت ہے۔ ۱۲۸
- صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں۔ ۱۳۲
- خدا کی یکتائی۔ ۱۳۸
- خدا کی غیر محدود قدرت۔ ۱۴۷
- علم خدا۔ ۱۵۶

◉ مباحث عدل: ۱۶۳

- نظریات دربارۂ عدل۔ ۱۶۴
- عالم پر شر و فساد کی حکمرانی کیوں! ۱۷۳
- مصائب عامل بیداری و حرکت ہیں۔ ۱۸۰
- نابرابری۔ ۱۸۸

◉ مسئلۂ جبر و اختیار: ۱۹۷

- اصل موضوع پر ایک نظر۔ ۱۹۹
- جبر کے قائل حضرات۔ ۲۰۸
- قائلین اختیار۔ ۲۱۶
- درمیانی بات۔ ۲۲۳
- مذہب اعتدال ۲۲۸

◉ مسئلۂ قضا و قدر: ۲۲۸

- قضا و قدر۔ ۲۳۶
- قضا و قدر کی ناقص تفسیر۔ ۲۴۲

عرض مترجم

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين و آلاف التحية و الاكرام على سيد المرسلين و آله المعصومين واللعنة الدائمة على اعدائهم اجمعين۔

اما بعد۔ کتاب "اسلامی اصول عقائد" اس دور کی بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ عصر حاضر کے پڑھے لکھے نوجوان ذہن کو بہت زیادہ اپیل کرتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے قدیم اور مغربی مفکرین کے عقائد و نظریات پیش کر کے اسلامی اصول کو سمجھایا گیا ہے۔ مادہ پرستوں کے مسلمات سے توحید الٰہی قرآن و احادیث سے عدل پروردگار کے اثبات پر اکتفا کرتے ہوئے موجودہ دور کے ایجادات سے بھی اثبات مطلب کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں صرف توحید، عدل، قضا و قدر، جبر و اختیار سے بحث ایک انوکھے انداز سے کی گئی ہے اہمیت کا احساس تو مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ترجمہ میں بعض مقامات پر مشکل الفاظ کا استعمال ہو گیا ہے۔ کچھ تو غیر اختیاری طور پر مگر بعض مقامات پر مجبوراً ایسا ہوا ہے۔ آخر اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کیا جائیگا؟ اور اگر آپ زبردستی کریں بھی تو آپ کا یعنی اور بین القوسین کی عبارت اس مفہوم کو ہرگز نہ سمجھا پائے گی جو صرف ایک اصطلاحی لفظ سمجھا دیتی۔ مگر میں پھر بھی معذرت خواہ ہوں کیونکہ اس سے زیادہ آسان زبان میرے دائرہ امکان سے شاید باہر کی بات ہو۔

یہ کتاب عربی، فارسی، انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہے اب یہ اردو زبان میں شائع ہونے جا رہی ہے۔

اس کتاب کا ایک دوسرا حصہ بھی ہے۔ جو تقریباً قریب اختتام ہے۔ اس کے بعد اس کو ترتیب دے

بھی بے مثال ہے۔

حجۃ الاسلام والمسلمین آقای سید مجتبیٰ موسوی لاری دام ظلہ العالی قابل صد تحسین ہیں کہ ان مشکل مسائل کو انھوں نے تا حد امکان بہت ہی آسان طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے مصنف کی ایک اور کتاب "بیمارئ تمدن غرب" کا ترجمہ "مغربی تمدن کی ایک جھلک" کے عنوان سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ غلطی، سہو و نسیان خمیر انسان میں شامل ہے اس سے صرف ماورائے عصمت ہی محفوظ ہیں۔ لہذا جو غلطیاں ہیں ان سے حقیر کو مطلع کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا تدارک کیا جا سکے۔

پروردگارا! اپنے اس ناچیز ترجمہ کو حضرت ولی عصرؑ کے طفیل سے تیری بارگاہ میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ خداوندا بطفیل محمدؐ و آل محمدؐ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرما کر میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔

والسلام

روشن علی

بحث معرفت خدا

خدا کی معرفت

اصول اور فکری بحثوں کے سلسلہ میں انسانی زندگی کے لئے ادیان کے مباحث کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور ہمیشہ یہ مباحث محل فکر و نظر رہے ہیں اور اساسی مسئلہ کی طرح انسانیت کی سعادت سے وابستہ رہے ہیں اور یہ مباحث بے فائدہ بھی نہیں ہیں بلکہ وسیع و عمیق پیمانہ پر ان کے عملی و ثقافتی آثار رہے ہیں۔

دینداری کے اسباب و علل کے سلسلہ میں علماء اور محققین کے وسیع مطالعات ہیں اور ہر شخص نے اپنے خصوصی زاویہ فن سے تحقیق بھی کی ہے اور ایسے نتائج و احکام بھی حاصل کئے ہیں جو ان کے خصوصی فکر و نظر کے مناسب ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ علوم و صنعتوں کی طرح بشری عقائد بھی درجہ کمال کو پہنچے ہیں۔ ماقبل تاریخ کے قدیم ترین زمانہ میں بھی عقائد کا وجود تھا جو بشری مجتمع سے متعلق تھے۔ کسی بھی زمانہ میں ایسے بشری مجتمع کا وجود نہیں ملتا جو عقیدہ سے خالی ہو۔

دینی افکار ایک دور سے دوسرے دور میں متغیر ہو کر منتقل ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح فکری اور علمی اصول اقدار و وسائل حیات کی طرح مکمل طریقہ سے تبدیل ہو کر انتقال پذیر ہوتے رہے ہیں اسی کے ضمن میں دینی فکر بھی بدلتی رہی ہے اور وہ اپنی پہلی صورت پر باقی نہیں رہ سکی ہے۔

انسانی زندگی کے تصورات اور اس کے علوم و معارف کے تکامل کی کیفیت کے بارے میں بحث و تمحیص اور آفاق تاریخ کی گہرائیوں کا مطالعہ ہم کو اس نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ عقلی استدلال کی معرفت سے پہلے بھی انسان کسی نہ کسی عقیدہ کا پابند تھا ـــــ اسی بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بشری علوم و صنائع کا پہلا دور انسانی عقائد و ادیان کے پہلے دور سے زیادہ برتر و کامل تر نہیں تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان

وعقیدہ کی بحث میں انسان نے جو کوششیں کی ہیں وہ علوم و صنائع کے سلسلہ میں کی گئی مساعی سے کہیں زیادہ سخت دشوار تھیں۔ کیونکہ اس بلند حقیقت کی معرفت جو عالم ہستی کی حقیقت ہے۔ تمام اشیاء کی حقیقت کی معرفت تک پہونچنے کیلئے علوم و صنائع متواتر رواں دواں ہیں ـــــ سے کہیں زیادہ سخت تر اور دشوار تر ہے۔

لوگوں کے لئے ایک زمانہ میں بزرگ ترین حقائق کا بطور کامل شناخت ناممکن ہے۔ بلکہ معلومات کی پیشرفت کے سایہ میں افکار عامہ بتدریج ان کی شناخت و معرفت کے لئے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ آمادگی پیدا کرتے ہیں۔

چمکتا ہوا سورج تمام چیزوں میں روشن تر اور واضح تر ہے لیکن ـــ اس کے باوجود ـــ صدیوں تک اس کی حقیقت مجہول رہی ہے۔ سورج کے حرکات و آثار کی مختلف تفسیریں کی جاتی تھیں حالانکہ اس کی اصل ہستی اور نورانی شعاع کسی کے لئے بھی قابل انکار نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی لوگوں کے افکار اس سلسلہ میں شدید گہری تاریکی میں تھے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حقیقت کبریٰ کا درک سوائے منطقی استدلال اور گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے سابق امتوں میں ضعف فکر اور محدود دانش و فکر کی وجہ سے بعض نامخصوص قالب میں جو خرافات اور دینی افسانے ڈھالے جاتے تھے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین اور اس کے محتویات حقیقت سے عاری ہیں۔ بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی جان و دل میں دین کی جڑیں مضبوطی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہرودتان[1] مشہور فلسفی کہتا ہے:
طبیعت انسانی کی بزرگ ترین جلوہ فشانی دین ہے۔ اور اگر علم رجعت قہقری کر کے ہمیں تاریخ کی دینی حقیقت کو بھی واضح کرنا چاہے تو ہم کو اس سے زیادہ کی توقع نہیں رکھنا چاہئے کہ جو نتیجہ ادیان سابقہ کا ہمارے سامنے آئیگا وہ ان خرافات و افسانوں کا مجموعہ ہوگا جو باقیماندہ آثار قدیم اور طبقات ارض کی گہرائیوں میں ہوگا۔

کیونکہ اس زمانہ کا انسان اگرچہ بہت سے فطرت کے حیرت انگیز و خوبصورت نظام کو دیکھتا تھا جو بہت ہی باریک بینی اور دقیق ترین حساب کے ساتھ جاری و ساری تھا اور دوسری طرف اس کو کبھی یہ اتفاق نہیں ہوا تھا کہ وسائل حیات میں سے کوئی چیز دفعتہً پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن اس حسن طبیعت کے مطالعہ کے باوجود انسانی اندیشہ و فکر کی دستگاہ، رشد و بلندی کے اس مرحلہ تک نہیں پہونچی تھی کہ جہاں پر وہ نظام عالم اور آثار طبیعت

---

[1] تاریخ مختصر ادیان بزرگ ([illegible])

اور اس کے مختلف مظاہر کے درمیان ارتباط کامل کی وحدت کا ادراک کر سکتا اور یہ سمجھ لیتا کہ تمام نظام ہستی ایک ایسے مبدء دانا و توانا کے زیر ارادہ و اختیار ہے جو انسان یا دیگر موجودات سے کسی بھی قسم کی شباہت نہیں رکھتا اور چونکہ گوناگوں موجودات کی پیدائش کو وہ منطقی بنیادوں پر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس کا خیال یہ تھا کہ ہر معلول کے لئے ایک مستقل علت ہے۔ لہٰذا وہ تعدد موجودات کو دیکھ کر تعدد خالق کا قائل ہو گیا۔ اور آخر کار مقدس کوشش اور انسانی عالی تمایل و بلند و اصل روحانیت اصل راستے سے منحرف ہو گئی اور خدائے حقیقی کے بجائے جھوٹے خداؤں کی طرف مائل ہو گئی اور ان کو پوجنے لگی اور احترام کرنے لگی اور نفس انسانی اور اس کے اردگرد موجودات پر قیاس کر کے جھوٹے خداؤں کے لئے صفات معین کر کے اپنے وجدان کو سکون بخشنے کا ذریعہ بنا لیا۔

اور جب انسان کی رفتار و حرکات دو خاصیتوں سے متصف ہو ۱) ثبات و ثبوت ۲) نوع انسانی کے تمام افراد میں عموم و شمول تو یہ بات بالکل منطقی اور فطری ہے کہ انسانی روح کی گہرائیوں میں اس کے رگ و ریشہ کا اتباع کریں۔

تمام ادوار تاریخ میں حتی قبل از تاریخ میں بھی عقیدہ انسانی کے وجود کو محض رسوم و عادات و تقلید کا مرہون منت نہیں کیا جا سکتا جو مستمر صورت میں ہمیشہ سے موجود ہے بلکہ یہ ایک فطری تشنگی اور ضروری احساس اور حقیقت کبریٰ کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے پس یہ تمام مذہبی اعتقادات اپنے گوناگوں اشکال کے ساتھ ایک پر جوش و سرشار منبع سے کسب فیض کرتے ہیں جو نہ تخیلی ہے نہ تصادفی۔

ابتدا ہی سے انسانی نہاد و طبیعت میں عقیدہ کی قبولیت و استعداد کی صلاحیت رہی ہے اور اسی ذاتی استعداد کی بنیاد پر عقیدہ تشکل پذیر ہوتا ہے اور یہی کوشش درونی جو حقیقت وجود کے ادراک کے لئے انسان کو فکری تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔ معرفت دین کی ضرورت پر دلیل قاطع ہے۔ لیکن اس ذاتی استعداد کا لازمی نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس عقیدہ کو اس نے مان لیا ہے وہ صد در صد صحیح ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ انسانی بدن میں احتیاج غذا موجود ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو جو غذا ملے وہ شیریں اور صد در صد صحیح ہو اسی طرح انسانی روح بھی روحانی غذا — ایمان و عقیدہ — کی محتاج ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو غذا اس کو ملے وہ صد در صد صحیح ہو۔ کیونکہ ذاتی طور پر یہ صحیح و فاسد عقائد میں تمیز نہیں کر سکتی۔

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمیشہ دینی عقائد بشری زندگی میں مخلوط رہے ہیں بیگن ازم[1] اور وہ سماجی عوامل جو مذہب کے بنیان گذاری میں کارفرما تھے اس میں ان کے نظریات مختلف ہیں اور ان محققین کے زیادہ تر فیصلے خرافاتی ادیان اور ناپختہ افکار کے مطالعہ پر مبنی ہیں اس سے بہت ہی واضح سی بات ہے کہ آخری تحلیل دین میں ان کے فیصلے ناقص و غیر منطقی ہوں گے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بہت سے ادیان مبدء حقیقی سے مرتبط نہ ہونے کی وجہ سے اپنے تکوین و پیدائش میں اپنے ماحول کے زیر اثر رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تمام ادیان بطور کلی مادی و اقتصادی یا طبعی و خطرناک عوامل کے خوف یا جہالت کی پیداوار ہیں۔ بے شک دین کے خلاف جو افکار پیدا ہوتے ہیں یا منکرین خدا جو وجود ہے اس کا سبب کچھ مذہبی لوگوں کی فکری انحرافات نا سمجھی و غلط کاری ہے لہذا ہر مذہب کے خصوصیات کو بھی خاص کر زیر بحث لایا جائے اور دقت نظر سے مطالعہ کیا جا سکے۔

بہت سے تاریخی حوادث میں آپ مذہب کو مجلہ قوانین پر حاکم دیکھیں گے اب اگر مذہب کی کوئی بنیاد نہ ہوتی تو ہمیشہ اپنے مادی دائرہ ہی میں محدود رہتا۔ آخر یہ کون سا عامل ہے جس نے مذہبی شخصیتوں کو اپنے دینی مقاصد کے لئے اتنا مضبوط و پائدار بنا دیا؟ کیا مادی منافع کی توقع اور خصوصی مقاصد نے مصائب و مشکلات کی جانکاہ تلخیوں کو ان کے لئے خوشگوار بنا دیا تھا؟ جی نہیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ اپنی تمام مادی و رفاہی امکانات کو اور اپنی شخصی خواہشات کو مقاصد دینی کے لئے اس بیدردی سے قربان نہ کر دیتے بلکہ انہوں نے تو اس راہ میں جان دیدی ہے۔

اس لئے یہ ناممکن بات ہے کہ محض مادی چیزوں کے لئے انسان دین کی طرف میلان رکھتا ہے بلکہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انسان کے باطن میں اصلی مذہبی حس موجود ہے۔ لیوکنت ڈونوئی کہتا ہے:

"ہمیشہ دنیا میں عبادت کامل کے لئے روح مذہب و میلان بہ عقیدہ و میلان پرستش و میلان فوق کی اور کمال مطلق سے نزدیکی — جو قابل تصور اور قابل وصول نہیں ہے — کا وجود تھا اور اس ارادہ کے لئے مبدء الہی تھا جو تمام لوگوں میں برابر موجود ہے۔"[1]

[1] ارتباط انسان و جہان ص ۱۹ — LECOMTE DU NOUY

مشہور دانشمند ویل ڈیورانٹ لکھتا ہے : ایمان فطری چیز ہے ۔ یہ ڈائریکٹ احساسات وطبعی تقاضا کا مرہون ہے اور حفظ نفس، گرسنگی، امان، اطاعت وانقیاد سے زیادہ قوی ہے ۔

اور یہ بات کہ مذہب میں غیر منطقی عقاید کا وجود ہے تو یہ بات مذہبی مسائل ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے علوم جہاں پہنچ سکے ہیں پہلے خرافات سے مخلوط تھے کیونکہ انسان علم طب حقیقی اور عقیدہ کی طرف جادو اور شعبدہ بازی ہی سے پہونچا ہے اور تحقیق کیا تک اس کی رسائی غیر واقعی کے ذریعہ ہوئی ہے ۔ بس ہی طرح غیر منطقی مسائل کی تنقیح وتحقیق کے بعد صحیح عقائد تک رسائی ہوسکتی ہے ۔ اور یہ تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اگر انسان نے کسی چیز کی تلاش میں ایک مرتبہ غلطی کرلی تو پھر کبھی حقیقت تک پہونچ ہی نہیں سکتا ۔

چنانچہ منکرین خدا اسی مسئلہ پر بھروسہ کر کے نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا تو افکار انسانی کی پیداوار ہے ۔ مثلاً برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSEL) انگریزی دانشمند کا کہنا ہے کہ عوامل طبیعی کے خوف سے مذہب نام کی چیز پیدا ہوئی ہے ۔ ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے : " میری نظر میں مذہب ہر چیز سے پہلے بنیادی طور پر ترس وخوف کی بنیاد پر استوار ہوا ہے ۔ ایک انجانا خوف ہے جس کی بناء پر لوگ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں ۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسی خوف کی وجہ سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے اور ہر انسان سوچتا ہے کہ مشکلات میں لڑائی جھگڑے میں اس کا کوئی پشت پناہ ہونا چاہئے ۔ اب یہ خوف مختلف ہوتا ہے ۔ موت کا خوف شکست کا خوف راز کے فاش ہونے کا خوف الخ

اگرچہ یہ بات محض شاعرانہ تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کے اثبات پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سیموئل کیننگ کہتا ہے : " مذہب کا منبع اسرار میں ایک مستور ہے اور علماء کے نظریات اس سلسلہ میں لاتعد ولاتحصیٰ ہیں بعض منطق سے قریب تر ہیں اور بعض غیر منطقی ہیں ۔ لیکن جو نظریہ سب سے زیادہ منطقی ہے وہ بھی محل اشکال ہے ۔ بس منطقی تصور کے اندر ہے ۔ اسی لئے علماء اجتماع منبع مذہب کے سلسلہ میں شدید اختلاف نظر رکھتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہ حل

۱؎ WIL DURANT ۲؎ بحوالہ ترشاہی کیننگ ص ۹۹ ۳؎ SAMUEL CANNING
۴؎ ذات عصر ص ۴۹۶

کے جواب میں کہا جا سکتا ہے ، اگر ہم فرض کر لیں کہ عقیدہ خالص میں سب سے اصلی اہم اور اصلی چیز ایک انجانا خوف ہے تو کیا اس سے یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ خدا محض ایک وہمی و خیالی چیز ہے اس کا کوئی واقعی وجود نہیں ہے؟ اگر خوف ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے رہائی کے لئے انسان ایک پناہ گاہ تلاش کرتا ہے اور اسی جستجو میں وہ حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو کیا اس میں کوئی اعتراض ہے؟ کوئی حرج ہے؟ اگر خوف ہی کسی چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو تو کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ علت جس کو انسان نے خوف کی وجہ سے حاصل کیا ہے لہٰذا موہوم و غیر واقعی ہے ؟

بھلا کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم کہنے لگیں علم طب کوئی واقعی علم نہیں ہے کیونکہ بیماری و مرگ کے خوف سے انسان نے اس پناہ گاہ کو تلاش کیا ہے لہٰذا یہ وہمی چیز ہے ؛ ویسے حقیقت یہی ہے کہ علم طب ایک واقعی چیز ہے چاہے اس تک پہونچنے کا ذریعہ و علت بیماری و مرگ کا خوف ہو یا کوئی دوسری علت ہو۔

تمام حوادث و واقعات میں ایک دانا و توانا خدا پر ایمان ایک پناہ گاہ اور حقیقی تکیہ گاہ ہے اور اپنی جگہ پر یہ خود ایک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے کہ دافع اصلی انسان میں خدا پر ایمان لانے کے لئے حوادث کا خوف ہے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ دیکھنا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بشر اپنی ابتدائی زندگی میں فطرت کے وحشتناک حوادث سے مثلاً طوفان ، زلزلے ، بیماریوں ۔۔ سے دوچار ہوتا رہا اور کابوس خوف اس کے تمام زندگی و افکار پر اپنا منحوس سایہ ڈالے ہوئے تھا اور اس مرحلہ میں انسان خوف و عاجزی کے باوجود اپنے مجاہدات شاقہ کے ذریعہ ایک ایسی پناہ گاہ کا جویاں رہا جس میں ایسے خوفناک حوادث سے پناہ حاصل کر سکے جس سے سکون روح حاصل ہو سکے آخر کار انسان اپنی سعی پیہم اور دائمی جستجو کے نتیجہ میں کابوس ذلت و خوف پر غالب آگیا اور قابل رشک کامیابی تک پہونچ گیا۔

قدیم انسانوں کی زندگی میں   بحث و فحص کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی افکار پر خوف غالب تھا مگر اس غلبہ خوف کا موجود ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ خوف و جہالت ہی تعبد بالدین کے علل اسباب ہیں کیونکہ ایسا طرز فکر تنگ نظری کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر تمام گوناگوں ادوار بشری تاریخ زندگی پر باقاعدہ مطالعہ و تحقیق و ریسرچ کے بعد یہ کلی نتیجہ اخذ کیا جائے تب تو ایک بات ہے لیکن اگر انسانی

تاریخ کے وسیع نشیب و فراز کے صرف ایک گوشہ پر تحقیق کر کے یہ نتیجہ نکالا جائے تو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔

ادوار محدود و معینہ میں تمام شئون انسان پر مسلط خوف کو بنیاد بنا کر تمام ادوار بشر پر ایک حکم کی لگا دینا غیر منطقی بات ہے اور کیا انسان کے افکار و احساسات دینی اور تمام زمانوں میں — حتی عصر حاضر میں — عبادت خدا کی طرف توجہ کو قہر طبیعت کے خوف و ہراس و جنگ بیماری کا نتیجہ قرار دینا جلد بازی نہیں ہے؟

نیز یہ بھی غلط ہے کہ ہر دین کا پجاری لوگوں میں کمزور ترین شخص ہوتا ہے! نہیں ایسا نہیں ہے صفحات تاریخ میں آج بھی موجود ہے کہ جن لوگوں نے دین کا پرچم بلند کیا ہے وہ سب سے زیادہ قوی اور مضبوط اشخاص تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ایمان جتنا قوی ہوتا جائیگا انسان اتنا ہی کمزور ہوتا جائیگا اور دینی رہبر سب سے زیادہ ذلیل و کمزور ہوگا۔

کیا ہزاروں علماء و مفکرین جو دین کے پیرو ہیں وہ زلزلے، سیلابوں، امراض کے خوف کی وجہ سے مذہب کے پابند ہوئے ہیں؟ یا یہ لوگ علمی تحقیق و منطقی استدلال و عقلی برہان کی بنا پر پابند مذہب ہوئے ہیں؟ کیا ان کی پابندی مذہب کو حوادث طبیعہ کی علتوں سے جہالت و عدم اطلاع پر مبنی کہا جا سکتا ہے؟ بھلا صاحبان عقل کیا فیصلہ کریں گے؟

انسان سکون و اطمینان کے لئے مذہب کو نہیں قبول کرتا بلکہ اعتقاد و ایمان باللہ کے بعد مذہب کے فوائد میں سے یہ بات ہے کہ اس کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے — الہٰی علماء کا عقیدہ ہے علل و معلولات اسباب و مسببات — جن کا بہت باریک بینی سے حساب کیا گیا ہے — کے مجموعہ کا نام عالم ہے اور کائنات کا دقیق نظام مبدء علم و قدرت کے وجود پر شاہد و دلیل ہے۔ کسی جو کھٹے میں مختلف و غیر منتظم و غیر مفہوم نقوش کا ہونا کسی ماہر و فنکار مصور کے وجود پر کبھی دلیل نہیں بنا کرتا۔ بلکہ ایسی نقاشی جو دقیق حساب پر مبنی ہو اور معانی و مطالب مفہوم پر مشتمل ہو اس کو ایک ماہر فنکار مصور کے وجود کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں جو لوگ مابعد الطبیعات کے عقیدہ کو اقتصادی اوضاع کی پیدائش بتاتے ہیں اور دین و اقتصاد میں ربط پیدا کرنے کیلئے جان توڑ کوشش کرتے ہیں

وہی لوگ کہتے ہیں: مذہب تو ہمیشہ سے استعمار و استکبار کا خادم تھا اور آج بھی ہے۔ اور حکمران حضرات نے دین کو ایجاد کیا ہے تاکہ دین کی آڑ میں لوگوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھیں۔ اور اسی کے سہارے عوام کی ہر بغاوت کو دبا کر دیں اور ان کی محنتوں کا ثمرہ خود حاصل کریں اور عقیدہ کا سہارا لے کر ان کی محرومیت پر ان کو قانع کر دیں ۔

ویسے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح مذہب سے بھی غلط فائدہ اٹھایا گیا اور جب بھی دین کو اس کے اصلی مقصد سے الگ کر کے غلط طریقہ سے استعمال کیا گیا تو نفع جو تاجروں کا ہتھیار بن گیا اور انہوں نے شعوب و قبائل کو قیدی بنانا چاہا۔ لیکن اس قسم کے غلط استعمال کو فرصت طلبوں کے لئے دلیل و حجت نہ بنا دینا چاہئے تاکہ وہ دین و مذہب کے نام پر ہر چیز پر بے رحم حملہ کریں۔ بہرحال خلاصہ مطلب یہ ہے کہ مذاہب محرف شدہ اور استعماری خود ساختہ مذاہب کو اصلی دین و مذہب سے الگ رکھنا چاہئے ۔

یہ ممکن ہے کہ بہت سے انسانی معاشروں میں مذہب و ایمان کے ساتھ نامساعد اقتصادی حالات و تاخر و جمود ہو لیکن یہ ہمراہی دونوں کے درمیان علاقہ علیت نہیں ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ مذہب و ایمان کی وجہ سے یہ نامساعد اقتصادی حالات اور تاخر و جمود پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے بھی انسانی معاشرے ہیں جہاں ہر لحاظ سے آرام و راحت رفاہ و رونق زندگی اور اقتصادی وضع بھی بہت اچھی ہے اور وہ معاشرہ مذہب و ایمان سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اسی طرح بہت سے انسانی معاشرے ایسے جو تمام سہولتوں اور بہترین اقتصادیات کے باوجود مذہب سے روگرداں ہیں۔ اسی طرح بہت سے ایسے مقامات ہیں جو فقر و تاخر میں مبتلا ہیں اور دین کا آفتاب وہاں غروب ہوا ہے اور بعینہ ایسی ہی صورت حال میں بعض ایسے مقامات ہیں جو فقر و تاخر میں مبتلا ہیں لیکن دین کا آفتاب وہاں دائرہ نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ پس یہ ناہماہنگی کہیں مذہب پرست اقتصادی لحاظ سے اچھے اور کہیں برے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ تقارن زمانی علاقہ علت و معلول کے کشف کرنے کو ناکافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک مخصوص وجہ اور بھی ہونی چاہئے جس سے پتہ چلے کہ ایک کا عدم و وجود دوسرے کے عدم و وجود سے مربوط ہے اسی قسم کے عدم انسجام و ناہماہنگی کو ہم ایسے دو معاشروں میں باقاعدہ ملاحظہ کر سکتے ہیں جو استعمار گروں کے تحت تسلط ہوں کہ ایک محیط میں دین اصل زندگی سے خارج ہے اور یہی دین دوسرے محیط میں اصل زندگی میں داخل ہے حالانکہ دونوں معاشرے مساوی و برابر ہیں۔

میں پھر عرض کرتا ہوں: دین و مذہب سے وابستگی مادی وسائل کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مذہب سے دوری کا سبب شہوت پرستی اور تجملات دنیا کی دلدادگی ہے جو لوگ خواہشات کے بندے اور دنیا پرست ہیں وہی لوگ مذہب سے دور اور متنفر ہیں ۔

واقعات ہم کو اس نتیجہ تک پہونچاتے ہیں کہ انسان مختلف اوضاع و احوال میں دین کی طرف متوجہ ہوتا ہے لہذا ہم کو ان اسباب و علل کی تلاش کرنی چاہئے جو گرویدگی مذہب کیلئے اصلی و معنوی و ذاتی ہوں نہ کہ وضع اقتصادی کے چکر میں پڑیں ۔ اس کے علاوہ اگر ہم آسمانی مذہب کے مقاصد کو تلاش کریں تو اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہیں رہیں گے کہ بعثت انبیاء کا ایک سبب اور لوگوں کی مذہب سے گرویدگی کی وجہ "عدالت اقتصادیہ" تھی اور دین کے من جملہ فوائد میں سے ایک یہی فائدہ ہے کہ انسان اقتصادی عدالت کو پالیتا ہے ۔

وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز

پیچیدہ جسم انسانی کے ماوراء انسان کے کچھ وسیع ابعاد ہیں جو محدودیت بدن کے ساتھ محدود نہیں ہیں اور ان ابعاد جو عمارت بدن سے خارج ہیں ـــ کے گوشوں کی معرفت کے لئے روحانی بنیادوں اور روزمرگی کے راستے سے تلاش و جستجو کرنی چاہئے تاکہ فیزیکی نشانات کے ماوراء ظواہر طبیعت و عواطف انسانیت کے وسیع آفاق تک رسائی ہوسکے۔

انسانی وجود میں ایک مخصوص ادراکات کا سلسلہ ہے جس کی جڑیں ذاتی ہیں اور وہ ادراک خمیر فطرت وطبیعت سے نشوونما پاتا ہے اور اس قسم کے معلومات کی پیدائش کیلئے کوئی خارجی عامل موثر نہیں ہے۔ انسان طبیعی علمی محیط اور اسکے مباحث میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اسی فطری معلومات کی بنیاد پر حقائق کا ادراک کرسکتا ہے لیکن علمی و منطقی معلومات میں داخل ہونے کے بعد اور اس کے دماغ میں مختلف دلائل وبراہین کے اکٹھا ہونے کے بعد بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ان فطری وطبیعی معلومات کو بھول جائے یا شک و تردّد میں مبتلا ہوجائے اور یہی وجہ کہ انسان جب تشخیص عقیدہ میں فطرت سے الگ ہوکر کام کرتا ہے تو وہیں سے اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔

مذہب سے وابستگی اور خدا پر ایمان پہلے مرحلہ میں فطری ادراکات کا نتیجہ ہوتا ہے پھر عقل و فکر کی مدد سے منزل رشد و کمال تک پہونچتا ہے۔ انسانی طبیعت میں فطری احساسات کی جڑیں اتنی گہری ہیں اور اس گہرائی کے باوجود اتنی روشن ہیں کہ اگر انسان اپنی فکر و روح کو ہر قسم کے مذہبی تصورات اور مخالف دینی افکار سے دھو ڈالے اور اپنی ذات و جہان ہستی کی طرف متوجہ ہو تو بخوبی اس بات کو محسوس کرے گا کہ کائنات کا قافلہ ہمیشہ سے ایک معین ہدف کی طرف رواں دواں ہے اور اپنے ارادہ و خواہش کے بغیر نقطہ زندگی کا آغاز کیا ہے اور پھر اپنے ارادہ کے بغیر ایک نقطہ ـــ اگرچہ اس کے لئے وہ نقطہ مجہول ہے

ـــ کیطرف رو بحرکت ہے اور اس واقعیت کے وجود کو فطرت کے تمام موجودات میں ایک منظم اسلوب اور مرتب نظم کے ساتھ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک روشن فکر انسان جب اپنے گرد و پیش کے ماحول کو دیکھتا ہے تو اس کو اچھی طرح یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ایک عظیم قدرت ہے جو اس کو اور تمام عالم کو محیط ہے جب وہ علم و قدرت و ارادہ کو اپنی ایسی ذات میں دیکھتا ہے جو اس عالم کبیر کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جزء ہے تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کائنات کے اندر علم و قدرت و ارادہ کارفرما نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہی موجودہ نظام اور یہی بروقت حسابی حرکت انسان کو اس بات کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس نظام کائنات کا ایک مدبر و حکیم ہے جو اپنے حکم سے اس کے موجودہ نظام کو چلا رہا ہے کیونکہ اس موجودہ نظام کی تفسیر مدبر و حکیم کے وجود کے علاوہ کی ہی نہیں جا سکتی جو شخص بھی سنجیدگی کے ساتھ اپنی موقعیت کا اس دنیا میں ادراک کرے گا وہ اس بات کو سمجھ جائیگا کہ اس کائنات میں ایک ایسی مخصوص قوت ہے جو اس کو پیدا کرتی ہے، عدم سے وجود میں لاتی ہے اور پھر اس کی اجازت یا کمک کے بغیر اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

یہ حکم فطری ہے کیونکہ کسی بشر نے کسی زمان یا مکان میں یہ نہیں دیکھا کہ صانع کے بغیر کوئی مصنوع ہو جائے یا عامل کے بغیر کسی عمل کا وجود ہو جائے۔ علت و معلول کے باہم ربط کی جستجو ایک باطنی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور قانون علیت کو کسی سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا اس مذہبی و جستجوئے خالق بھی انسان نے قائل جبلی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ابھی جس بچے نے دنیا نہیں دیکھی ہے اگر اس کے کان میں کوئی آواز پہونچے یا حرکت کا مشاہدہ کرے تو فوراً فطری طور پر منبع آواز و منشاء حرکت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

عملی زندگی کی بنیاد اور علمی مبانی بھی ہر معلول کے لئے علت کو لازمی قرار دیتے ہیں بلکہ قانون علیت ایک ایسا معمولی قانون ہے جو ایک مورد پر بھی استثناء بردار نہیں ہے۔ تمام علوم خواہ وہ علم طبقات الارض یا فیزیا ہو یا کیمیا ہو یا علم اجتماع و اقتصاد ہو ان سب میں علیت و معلولیت کا قانون نافذ ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام علوم و دانش عوامل و علل کے کشف کا ذریعہ ہیں اور دنیا میں تمام بشریت کی پیشرفت و ترقیاں علماء کے تلاش علل کا نتیجہ ہیں۔

اگر اس دنیا کے کسی گوشہ میں کسی بھی موجود کے اندر خود سازی مطلق و خلاقیت کا امکان ہوتا تو ہم کو یہ حق ہوتا کہ تمام موجودات میں وجود ذاتی کو قبول کر لیتے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قانون علیت ظواہر عادی کی صورت میں ہمارے لئے واضح و ظاہر ہو کیونکہ علت کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں کہ تحقیق و بررسی کر کے ہم صرف ایک حادثہ میں تمام علتوں کی تشخیص نہیں کر سکتے ــ چہ جائیکہ تمام حوادث میں ــ اور یہ مسلم ہے کہ انسانی زندگی کے ماضی و مستقبال میں کسی بھی کلی یا جزئی صورت میں ــ خواہ وہ فرد کی حالت یا معاشرہ کی ــ کسی ایسے نقطہ کا بھی وجود نہیں ہے جو اتفاقاً پیدا ہو گیا ہو۔

جب تمام تجرباتی علوم کا فیصلہ ہے کہ عناصر طبیعت میں سے کسی ایک عنصر کا وجود مستقل نہیں ہے۔ اور جب ہمارے تمام تجربات و احساسات و استنباطات بھی ایک ہی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ طبیعت میں کوئی بھی امر بغیر علت و دلیل کے واقع نہیں ہوا اور تمام حوادثات کچھ مخصوص نظام و قوانین کے تابع ہیں تو پھر کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ کچھ لوگ تمام علمی و فطری و عقلی احکام کو پس پشت ڈال کر خالق کائنات کے وجود کے منکر ہیں :

دوسرے طریقہ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہی غریزہ حیوانی جو کامل و متحول ہوئی ہے اور جو محدودیت سے اس قدر باہر آگئی ہے کہ محسوسات کی دیواروں سے گذر کر مجہولات کو درک کرتی ہے اور انسانی ضمیر سے پیدا ہونے والے ہر حکم و مسئلہ ــ بشرطیکہ وہ ایک مخصوص تربیتی و اعتقادی معاشرہ کے سسٹم سے متولد نہ ہوا ہو ــ کا جواب دیتی ہے وہ یہی فطرت ہے۔ اور اصالت و عمومیت کے لحاظ سے اس فطرت میں اور دوسری انسانی فطرتوں ــ جیسے حب ذات و حب وجود ــ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا یہی فطرت انسان کو وجود خالق کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن تربیت، ماحول و معاشرہ قسم کی چیزیں فطرت کے تقاضے کو پورا نہیں ہونے دیتیں۔ چنانچہ والٹر اوسکار لینڈ برگ ([illegible])

OSCAR ـ ـ جو فیزیالوجی کا بہت بڑا مشہور عالم ہے لکھتا ہے: علمی مطالعات میں بعض علماء جو وجود خدا کا احساس نہیں کر پاتے اس کی بہت سی وجوہ ہیں ان میں سے ایک علت مستقل سیاسی اوضاع و احوال یا معاشرتی نظام یا دولت و حکومت کے مقتضیات ہیں جو انسان کو وجود پروردگار کے انکار

پر آمادہ کرتے ہیں۔[1]

مبدءِ فطرت سے نمودار ہونے والی چیز نظامِ طبیعی کی مانند خوبصورت ہے اور جو لوگ اپنی پیدائش کے مسیرِ اصلی میں آزاد رہے ہیں، عادتوں کے زندان میں مقید نہیں رہے ہیں اور نہ ان کی فطرت نے لغات و اصطلاحات کا رنگ پکڑا ہے وہ ضمیر کی آواز کو بہت بہتر طریقے سے سن لیتے ہیں اور اعمال میں نیک و بد اور عقائد میں حق و باطل کی اچھی طرح تمیز کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے افراد میں بیدینی اور فطرت سے انحراف بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ جہان رنگ و بو اتفاق سے پیدا ہو گیا ہے۔ تو چاہے وہ اپنی باتوں کو ہزاروں فلسفی اصطلاحات کے قالب میں ڈھالے پھر بھی ان کی باتیں ایسے افراد پر اثر انداز نہیں ہوتیں کیونکہ انھوں نے اپنی فطرت کے سہارے تصادف کائنات کے نظریہ کو رد کر دیا ہے۔

البتہ جو لوگ علمی خود ساختہ زندگی میں گرفتار ہیں وہ ان خوبصورت باتوں سے شک و تردید میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ محدود و غرور انگیز علوم ان رنگ برنگ شیشوں کی طرح ہیں جو عقل و فطرت کے دریچے کے سامنے لگا دیے گئے ہوں۔ اور یہ لوگ دنیا کو اپنے علوم و معارف و فنون کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور یہ یقین کرتے ہیں کہ عقل و حواس اور محدود دریچے سے جو انھوں نے دیکھا ہے بس اصلی حقیقت وہی ہے اور اس کے ماورا کچھ نہیں ہے۔ میری اس تحریر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان تکامل عقلی سے باز رہ جائے تاکہ وہ انحراف سے دوچار نہ ہونے پائے بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ انسان اپنی محدود دانش و فن پر مغرور نہ ہو جائے۔

بہت سے لوگ علم و دانش کو بجائے عقل کی سیڑھی بنا کر اپنے بالا سطح تک پہونچانے کے بغیر گرفتار ہو جاتے ہیں اور اصطلاحات و مفہومات کی چار دیواری میں اپنے کو زندانی بنا کر رکھتے ہیں۔

جب انسان خطرے میں گھر جاتا ہے تو یہی فطرت اس کی مدد کے لئے بڑھتی ہے۔ جب کبھی انسان خوفناک مشکلات اور خوفناک سختی میں گھر جاتا ہے اور تمام مادی وسائل اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور زندگی کے کسی امکان تک اسکی رسائی ناممکن ہو جاتی ہے اور تنکے کی طرح دریائے حوادث میں غوطہ کھاتا ہوتا ہے۔ اس کے اور موت کے درمیان ایک قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں رہ جاتا تو وہی باطنی عامل بے اختیار ایک غیر مادی پناہ گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ایسی ذات کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کی طاقت تمام طاقتوں سے بلند

---

[1] اثبات وجود خدا صفحہ

دیا جاتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ مہربان وجود اتنا طاقتور ہے کہ اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ اس کو ان مصائب سے آزاد کرا سکتا ہے اور اسی دریافت کی وجہ سے وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس کی بارگاہ اقدس سے طالب مدد ہوتا ہے اور دل کے گوشہ میں اس کی نجات و رہائی دینے کی طاقت کا احساس کرتا ہے اور یہ ہے کہ وہ ثروت مند باغی و طاغی و سرکش و مادہ پرست حضرات جو اقتدار کے نشہ میں قدرت الٰہی سے بے پرواہ و مستغنی ہوتے ہیں جب شکست و نابودی سے دوچار ہوتے ہیں تو مدرسوں اور ماحول کی وہ تمام تعلیم بھلا دیتے ہیں جس میں ان کو بتایا گیا تھا کہ خدا وہم و خیال ہے وہ کچھ نہیں ہے اور دل و جان سے مبدء وجود و سرچشمہ توانائی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات میں آج بھی ایسے لوگوں کے واقعات موجود ہیں جنہوں نے سختی و پریشانی کے عالم میں اپنی فطرت کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب نوچ پھینکا ہے اور دل و جان سے خدائے بے ہمتا کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

چنانچہ دیدرو "DIEDRO" فرانس کا ایک بہت بڑا مادہ پرست فلسفی ہے جو اپنی کتاب "اصالت مادہ و ماتریالیسم" کے آخر میں چند ایسے دعائیہ فقرے لکھتا ہے جو نداے فطرت و رفتار وجدان کے عکس العمل ہیں، وہ کہتا ہے:-

"خدایا! میں نے اپنے بیان کا آغاز اس طبیعت سے کیا ہے جس کو خدا پرست تیرا شاہکار مانتے ہیں اور میں اپنا بیان تجھ پر ختم کرتا ہوں کہ تیرا نام اہل زمین کے یہاں خدا ہے۔ پروردگارا! میں سوچتا ہوں، تو ہے اور میرے ضمیر و حالات سے واقف ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ماضی میں تیرے حکم کے خلاف اور اپنی عقل کے خلاف کوئی کام کیا ہے تو اس سے نادم و پشیمان ہوں گا، لیکن آئندہ کے لئے آسودہ ہوں کیونکہ جب میں اپنے گناہ کا اقرار کروں گا تو تو بخشش دے گا۔ اس دنیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، کیونکہ جو بھی ہوگا وہ یا تیرے حکم سے ہوگا یا قانون فطرت کی بنا پر ہوگا، لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا عالم ہے تو تجھ سے پاداش کی امید رکھتا ہوں اگرچہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ اپنے لئے کیا ہے۔" (نشانہ و آثار بشری ص ۲۱۹)

ان باطنی منابع کے علاوہ جو فطرت انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور جو واقعات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں تاکہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ فطری اصولوں کے مطابق، گمراہ کن پروپیگنڈوں اور ذہنی انحرافات سے دور ہو کر اپنے لئے ایک راستہ منتخب کرے۔ ایک ہدایت و ارشاد کا عامل خارج از وجود بھی ہونا ضروری ہے جو عقل و فطرت کی تقویت اور رہنمائی کر سکے تاکہ سرکش طبیعتوں اور بے لگام افراط کی اصلاح کر سکے اور عقل و فطرت کو بھی انحراف سے باز رکھے اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے روک سکے ایک ایسے خارجی ہادی و رہبر کا بھی ہونا ضروری ہے۔

اور یہ خارجی ہادی نبی و رسول کہلاتا ہے اور ان کو ـــ یعنی انبیاء و رسل ـ بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ یہ انسان کو لطیف فطری اور کمالات کی طرف متوجہ کریں اور خدا پرستی اور بلند مقاصد کی طرف قیادت کریں۔

انبیاء کی ہدایت و ارشاد کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ انسانی ارادہ کے خلاق شعلوں کو خاموش کر دیں یعنی اسکی قوت فکر و انتخاب کی آزادی کو سلب کریں، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ فطرت انسان کے ایجابی رجحانات کے لئے ایک مدد معاون ہیں اور جس کا مقصد صرف انسان کو قید و بند سے آزاد کرانا اور انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے فطرت و سرشت سے استفادہ کر سکے۔

سب سے پہلے انبیاء کی دعوت قبول کرنے والے وہی لوگ تھے جو پاک دل اور روشن ضمیر تھے اور انبیاءؑ کی مخالفت کرنیوالے یا تو دولت مند اور فرسودہ روایات کے پابند حضرات تھے یا ایسے لوگ جو اپنی عقل ناقص و ناچیز دانش پر مغرور تھے اور انکی جاہلی نخوت و غرور ہمیشہ انسانی استعدادات سے استفادہ سے مانع رہی۔

ایک دانشمند کہتا ہے :۔

> "قانون عرض و طلب معنویات تک میں حاکم ہے کیونکہ اگر دین کی خواہش لوگوں کی فطرت میں موجود نہ ہوتی انبیاء کی تبلیغ بیکار رہتی حالانکہ انبیاء کی تبلیغ بے اثر نہیں رہی ہے بلکہ انکی دعوت پر لبیک کہنے والے حضرات کافی تعداد میں تھے اور یہی بہت بڑی دلیل ہے کہ لوگوں کے باطن اور انسانی ضمیر میں دین کی طلب موجود تھی۔"

انبیاء کی دعوت ہمیشہ مبنی بر توحید تھی نہ کہ اثبات وجود خدا پر تھی۔ انبیاء بت پرستی، ستارہ پرستی، سورج پرستی و چاند پرستی اور اور ...... وغیرہ سے اس لئے روکا کرتے تھے تاکہ بشر کی فطری اندرونی پیاس خارجی غلط مصادیق — مثلاً بت پرستی و ستارہ پرستی وغیرہ — سے نہ بجھے بلکہ ان کی دعوت و تبلیغ کا مقصد ہر قسم کی کجروی و انحراف سے دور ہو کر خدائے برتر و برحق کی طرف انسانی ذہن کو متوجہ کرنا تھا، اور ان کا ہدف یہ تھا کہ لوگ کمال لا متناہی کے گرویدہ ہوں اور ایسے کامل ایمان کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے ہدف نہائی تک پہونچ جائیں۔

پس یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شرک و بت پرستی اپنی تمام اقسام کے ساتھ خواہ ترقی یافتہ صورت میں ہو — مثلاً مادہ پرستی — یا غیر ترقی یافتہ صورت میں ہو مثلاً بت پرستی یہ سب فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

علوم کی ترقی بالخصوص دینی تجربہ — جیسا کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ ظہور ہے — نے ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کی بنا پر ہم بڑے قیمتی نتائج اپنی موجودہ بحث کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک طرف سے تاریخ ادیان نے علمائے جامعہ شناسی و باستان شناسی و مردم شناسی کے ذریعے ایسے قابل قدر مدارک و اسناد مہیا کر دیئے ہیں جو سابق کی تمام تفاسیر سے الگ تھلگ ہیں اور دوسری طرف سے نفسیات و خود شناختی کی کاوشوں کے ذریعہ جن کا آغاز فرائیڈ[۱] کے ذریعہ ہوا اور اڈلر[۲] اور یونگ[۳] کی سعی مسلسل کے سبب انسان کے اعماق روح میں مخفی طاقتوں اور غیر عقلی ادراک و معرفت کے بہاؤ پہ پہونچا اور پھر جس نے عوامل غیر عقلیہ اور ماورائے ارادہ — جیسے دینی احساس — کے لئے علمی تجربات کا دروازہ کھول دیا۔

اور آج بھی ایک فکری بحث جاری ہے جس کے نتیجہ میں مختلف مکتب فکر کے کافی سے زیادہ مفکرین اس اصل کے معتقد ہو چکے ہیں۔ یعنی اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ دینی احساس بھی روح انسان کے ثابت و فطری و عناصر اولیہ میں سے ایک عنصر ہے۔ اور فطری ادراک بھی ماورائے عقل کے ادراک کی ایک قسم ہے۔

---

۱ FREUD, ANNA ۲ ADLER, HELMUTH ۳ YOUNG

حدود ۱۹۲۰ء سے یونانی محقق روڈلف[1] اٹو نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ حسِ دینی میں عناصر عقلیہ و اخلاقیہ کے علاوہ کچھ فطری یا ماوراء عقل عناصر بھی موجود ہیں اور تمام الٰہی صفات مثلاً قدرت و قداست و کبریت صرف مفہوم قدس کے افہام و تفہیم کے لئے ہیں کہ مفہوم قدس کی بازگشت کسی عقلی ادراک کی طرف نہیں ہے بلکہ مفہوم قدس ایک مستقل منفرد ہے جو کسی بھی دوسرے مفہوم سے ناشی نہیں ہے اور نہ ہی کسی مفہوم عقلی یا غیر عقلی کے ساتھ اسے ایک شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے عالم طبیعت میں ایک بعد رابع کا بنام زمان انکشاف کیا ہے جو دیگر ابعاد کی طرح جسم میں آمیختہ ہے اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ دنیا کے اندر کوئی ایسا جسم موجود نہیں ہے جو اس زمان سے خالی ہو جو حرکت و تحول سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اس زمانے کے علماء نے ایک بعد رابع کے وجود کی تحقیق کی ہے جو انسانی روح میں احساس دینی کے نام سے پہچانا جاتا ہے[2]۔ باقی تینوں احساس درج ذیل ہیں:۔

(۱) **حسِ جستجو و معرفت:** اور یہ باطنی تشنگی و پیاس ہے جس نے اول روز سے فکر بشر کو مسائل مجہول اور ناشناختہ جہان ہستی اور اس کے گوناگوں مظاہر کی تحقیق و جستجو پر آمادہ کیا اور اسی تحقیق کے نتیجہ میں علوم و صنائع کا وجود ہوا ہے۔ اور تمام وہ سختیاں و زحمتیں جس کو محققین و موسسین علوم اور اسرار طبیعت سے پردہ اٹھانے والے علماء برداشت کرتے ہیں اس کا سرچشمہ یہی احساس ہے۔

(۲) **حسِ نیکی:** جو انسان کے بلند روحانی صفات و فضائل کا مرجع ہے۔ ہر انسان جو اپنے وجدان کے گہرائیوں میں ایک ایسی کشش محسوس کرتا ہے جو اس کو عدل و نوع دوستی اور فداکاری کی طرف کھینچتی ہے وہ کشش پاکیزہ اخلاق کی طرف توجہ اور کثافت و غلاظت سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

(۳) **حسِ زیبائی:** انواع ہنر و ذوقیات کے ظہور و تجلی کا سبب یہی ہے اور اجتماعی حوادث کے ظہور میں اس کا گہرا اثر ہے۔

---

[1] RODALPHT   [2] حس دینی، ترجمہ مہندس بیانی۔

(۴) حسِ دینی : اسی احساس کی وجہ سے ہر شخص فطرتاً ماوراء طبیعت کی طرف ایک کشش و میلان رکھتا ہے اور یہی مفاہیم ثلاثہ کے استقلال کا ضامن ہے۔ احساس مذہبی کے انکشاف کے ساتھ ہی روحانی ابعاد ثلاثہ کا حصار ٹوٹ گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان کے اندر تمام مذہبی تمایلات ذاتی طور سے موجود ہیں بلکہ ان کا وجود اس وقت بھی تھا جب انسان جنگلوں اور پہاڑوں پر زندگی بسر کرتا تھا۔

مبدءِ وجود کی معرفت حاصل کرنے کے لئے متعدد طریقے ہیں۔ غیر عقلی (فطری) اور عقلی حاجات کا جواب گو خود خدا کا مفہوم ہے۔ اس طرح سے کہ نظم و آیات و علامات کے ذریعہ عقل وجودِ پروردگار کا یقین محکم کرتی ہے اور فطرت عشق و فطری نیازمندیوں کے راستے سے خدا سے ارتباط پیدا کرتی ہے اور وہ ارتباط اتنا قوی ہوتا ہے کہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے لیکن بصارت کے ذریعہ نہیں بلکہ بصیرت کے ذریعہ — اگر دل کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کی جائے تو اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔

آج کا علم اگرچہ استدلال کرنے کے لئے تجربات کا سہارا لیتا ہے لیکن پھر بھی خدا کی توحید جو بحث و استدلال کا براہ راست نتیجہ ہے — خواہ استدلال عقلی و فلسفی ہو یا تجربات و حسیات کا نتیجہ ہو — وہ بہرحال استدلالی توحید ہے۔

ڈیکارٹ (DECART) اور سینٹ تھامس ڈاکن (ST. THOMOS DACAN) جیسے علماء عقل و برہان اور فکرِ علمی کے محور کے سے خدا کی معرفت کے واضح نتیجہ تک پہونچے ہیں اور پسکال فرانسوی جیسے عرفاء شہودِ باطنی اور فطرت کے سہارے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں۔ پاسکال فرانسوی کا کہنا ہے: "خدا پر ایمان لانے کے لئے انسانی دل کے پاس ایسے دلائل ہیں جہاں تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے"[1]۔ انشٹائن کا طرزِ فکر کچھ اس طرح ہے: "زیباترین و دقیق ترین احساس جو انسان کو حاصل ہو سکتا ہے وہ "حسِ عرفانی" ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تمام واقعی علوم کے بیج ہمارے دلوں میں کاشت کرتا ہے اور جو شخص اس احساس کا شعور نہ رکھتا ہو اور متحیر و مبہوت نہ ہو سکتا ہو وہ مثل میت کے ہے"[2]۔

---

[1] سیر حکمت در اروپا ص ۱۰۱ ج ۲
[2] حس مذہبی ص ۲

فیلسوف جرمنی عالم شوپن ہاور دینی احساس کو انسان کے اندر اتنا گہرا خیال کرتا ہے کہ اسی "حسِ دینی" کو انسان کا تمام حیوانات سے فصل ممیز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے :-

"انسان وہ حیوان ہے جو میٹا فیزیقیا کا معتقد ہو" [1]

حسِ جستجو و معرفت، حسِ نیکی، حسِ زیبائی اپنی تمام اصالت و استقلال اور تاثیر جو اخلاق و ہنر اور علوم کی پیدائش میں رکھتی ہیں، ان سب کے باوجود حسِ دینی ان تینوں سے حسِ جستجو، حسِ نیکی، حسِ زیبائی کی تحریک و فعالیت کے لئے زمین ہموار کرتی ہے اور آمادہ کرتی ہے اور ان تینوں کی مدد و معاون ہوتی ہے عالم طبیعت کے کشف اسرار کے سلسلہ میں حسِ دینی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مرد مومن کی نظر میں دنیا ایک نقشۂ دقیق و حساب شدہ اور قوانین کی بنیاد پر پیدا کی گئی ہے اور خدائے مدبر و حکیم پروردگار کے زیر سایہ انسان کی حسِ جستجو حرکت کرتی ہے تاکہ علت و معلول کے سلسلہ پر پیدا کی گئی دنیا میں طبیعت کے آثار و قوانین کے انکشاف کی راہ میں تلاش و کوشش کرے۔

ویل ڈورانٹ کہتا ہے :-

"ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ ہے کہ کاہن حضرات ہی پہلے علماء ہیں جس طرح کہ وہ پہلے ادبا بھی ہیں نلکی رصدگاہوں کا مشاہدہ کرکے علم کا آغاز کرنے والے یہی لوگ ہیں جن کا مقصد دینی جشنوں کے اوقات کا دقت نظر کے ساتھ تعیین کرنا تھا اور اس قسم کے معلومات و اطلاعات کو معابد میں محفوظ رکھا جاتا تھا اور یہ دینی ورثہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہتا تھا۔" [3]

انسان کے صفات عالیہ اور اسکی رشد و ہدایت اور تعدیل غرائز اور درخت اخلاق و فضیلت کے ثمر آور بنانے میں حسِ دینی کا جو ہاتھ ہے وہ ناقابل انکار ہے۔ جو لوگ بھی دین کے راستہ پر چلتے ہیں وہ غرائز کے کنٹرول اور بلند صفات سے آراستگی کو اہم ترین دینی فریضہ خیال کرتے ہیں۔

دور تاریخ کے اندر حسِ زیبائی کی پرورش میں دینی تفکر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ل SHOPENHAUER، ت میٹا فیزیک حسین شاد ص١، تہ تاریخ ویل ڈورانٹ ج ا ص ١٣١

سہ یعنی مابعد الطبیعیات

کیونکہ قدیم انسان نے اپنے بزرگترین فنی آثار کو صرف اپنے خداؤں کے تعظیم کے لئے ایجاد کئے تھے چین کے عجیب و غریب عبادت خانے، مصر کے عظیم اہرام، میکسکو کے خوبصورت مجسمے، مشرق اسلامی کے خوبصورت اور محیر العقول فن تعمیر، یہ ساری چیزیں حس دینی ہی کے آثار ہیں۔

ماہرین نفسیات کا عقیدہ ہے۔ بلوغ اور جوش احساس دینی کے درمیان ایک علاقہ ہے اور زندگی کے اسی حصہ میں دینی مسائل کی طرف ان افراد کی بھی مخصوص توجہ ہو جاتی ہے جو اس وقت تک مسائل دینی کی طرف بے توجہ تھے۔

استانلے (STANLEY) کا نظریہ ہے کہ یہ مذہبی احساسات سولہ سال کی عمر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس موضوع کو جوان کی شخصیت کی وسعتوں میں سے ایک صورت حساب کیا جا سکتا ہے یہی احساسات جوان کو" جو مختلف قوتوں کے تحت تاثیر ہے" اس بات کے مجاز بناتے ہیں کہ وہ اپنے وجود کی علت غائی کو ذات پروردگار عالم میں تلاش کرے۔[۱]

یہ بات محفوظ خاطر رہے کہ فطرت انسانی کی آواز اسی وقت متجلی ہوتی ہے جب اس کے مد مقابل کوئی مانع نہ ہو لیکن اگر مخالف تبلیغ موجود ہو تو وہ فطرت اور فکر صحیح کے فعالیت پر مائل کر دیتی ہے اگرچہ اس قسم کے موانع انسان کے طبعی رجحانات کو جڑ سے ختم نہیں کر پاتے اور یہی وجہ ہے کہ اگر یہ مانع کو توڑ دیا جائے تو فطرت اصلی پھر سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور خلاق دروں کی تلاش کے ساتھ اپنی تجلی کا آغاز کر دیتی ہے۔

تمام دنیا کے لوگ جانتے ہیں روس کے اندر کمیونزم کو آتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی لیکن اس کے باوجود روس میں بہت بڑے طبقہ میں دینی احساس اب بھی موجود ہے اور زمامداران حکومت کی طرف سے اس طولانی مدت میں دین و مذہب کے مٹانے کے لئے اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کر دینے کے باوجود لاکھوں انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے دینی احساس کو خالی نہیں کیا جا سکا۔

---

[۱] بلوغ ص۱۱۱ از مسعود محمد قیم

اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں: دنیا کے اندر مسلسل مادی افکار عقیدۂ خدا کے فطری ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ کسی خاص مذہب کی راہِ فطرت سے دوری اور جدائی کو دیگر مکاتیب فکر اور مابعد الطبیعات کے قائل مدارس ــ خواہ آج کے ہوں یا پہلے کے ــ کے بالمقابل خداشناسی کے فطری ہونے کو ناقض نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ ہر عام میں تخصیص پائی جاتی ہے اور ہر کلی میں استثناء ہوا کرتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے مذہب مادی فلسفی کی بنیاد قرن ششم و ہفتم قبل مسیح میں پڑتی ہے اور اس عہد میں مذہب مادی کی حمایت کرنے والے حضرات حسب ترتیب ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) طالیس (TALESS) ــ یہ یونان کا فلسفی ہے ۶۲۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۴۰ یا ۵۴۶ ق م میں مرگیا۔

(۲) ہراکلیتس (HERACLITUS) ــ یہ ۵۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۷۵ ق م میں فوت ہوا۔

(۳) ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) اس کا زمانہ ۴۷۰ ق م ہے۔

(۴) اپیکور (EPICHORE) اس کا زمانہ ۳۴۱ ق م ہے۔ لیکن ان سب کا مادی ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، کیونکہ مثلاً بعض علماء جیسے بانگون اپنی کتاب تاریخ الفلسفہ میں طالیس کے لئے تحریر کرتا ہے: طالس کا عقیدہ تھا کہ مادی تغیرات، روحانی عوامل کے تحت تاثیر ہوا کرتے ہیں اور ڈیموکریت کیلئے لکھا ہے، ڈیموکریٹ مادی نہیں تھا وہ وجود ارواح کا قائل تھا۔ البتہ اٹھارھویں صدی میں مادی مذہب کی ترقی شروع ہوئی اور سائنس دانوں میں اس کے طرفدار پیدا ہونے لگے اگرچہ ان میں سے بھی بعض کے متعلق مختلف نظریے ہیں مثلاً جان جاک روسو[1] کے بارے میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ مادی مذہب کا قائل تھا اور دوسرے لوگ کہتے ہیں وہ خدا پرست تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی اس لئے کہا گیا ہو کہ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں گرجاؤں اور ان کے پوپ حضرات کی بڑی شدت سے مخالفت کی تھی۔

۱؎ ROUSSEAU, JEAN JACQUES

ڈاکٹر محمد فرید وجدی اپنی مشہور کتاب انسائیکلوپیڈیا میں (ردعو) کے تحت تحریر کرتے ہیں کہ مبدء وجود کے بارے میں ردعو نے کہا ہے۔ فطری قوتوں کے ہاتھوں جو حوادث پیدا ہوتے ہیں اور بعض کی تاثیر جو بعض میں ہوتی ہے اس کے بارے میں جتنا بھی غور و فکر کرتا ہوں قاعدہ "الانتقال من نتیجہ الی اخری" سے میرے نزدیک یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ سبب اول صاحب ارادہ و ادراک اور صاحب شعور ہے۔ اسی لئے میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ ارادۂ خدا ہی نے وجود کو حرکت دیا اور مردوں کو زندہ کیا، لیکن تم کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ پھر وہ خدا آخر کہاں ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ جن آسمانوں کو اس نے متحرک بنایا اور جن ستاروں کو نور بخشا ان سب میں خدا موجود ہے اور خدا نہ صرف یہ کہ مجھ میں ہے بلکہ چرنے والی گوسفند، اڑنے والے پرندے، زمین پر پڑے پتھر، درختوں کے وہ پتے جن سے ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہے ان میں بھی خدا ہے بلکہ خدا ہر جگہ ہے۔ لہٰذا وہ نظریات کتنے بعید از عقل ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ نظام بدیع ایک ایسی اندھی حرکت کا نتیجہ ہے جو اتفاقاً مادہ میں پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں کا جو جی چاہے کہیں لیکن میری نظر میں جو مستحکم نظام موجودات میں ہے اس کا مطالعہ کروں اور اس میں جو حکمت ودیعت کی گئی ہے اس کا ادراک نہ کروں تو یہ محال ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ کہہ سکوں کہ مردہ مادہ زندہ موجودات کو پیدا کر سکتا ہے اور اندھی ضرورت عاقل کائنات پیدا کر سکتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس خود ہی عقل نہ ہو وہ ایسی چیز پیدا کر سکے جو صاحب عقل ہو!

خدا اور تجرباتی علوم کی منطق

یہ مسلم ہے کہ اوضاع اجتماعی اور تربیتی و تاریخی عوامل اور انسان کے نوعی مشاغل اپنے عاطفی اور روحانی عوامل اور فطری خواہشات میں بے تاثیر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ یہ گوناگوں مشاغل انسانی خواہشات میں ایجاد جبر و ضرورت نہیں کرتے مگر پھر بھی اس کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کر دیتے ہیں جو عقل انسانی میں ایک نقش مبہم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بلکہ کبھی انسان کی آزادی اور اختیار و انتخاب کے سامنے مانع بنکر خود نمائی کرتے ہیں۔

انسان کی دماغی قوتیں جس کسی مخصوص موضوع پر زیادہ کام کرتی ہیں اسی مخصوص موضوع میں وہ زیادہ مہارت اور طاقت حاصل کرتی ہیں اور اس کے علاوہ دیگر مسائل اپنی اصالت کھو بیٹھتے ہیں اور اس مخصوص موضوع کے علاوہ تمام مسائل غیر اصلی و فرعی ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر اس کے سارے فیصلے اسی نظریے کے پیش نظر ہوتے ہیں — یہ بات یاد رکھئے کہ سب سے گمراہ کن طریقہ یہ رہا ہے کہ فکر انسانی کو صرف تجرباتی علوم اور سائنس تک محدود کر دیا گیا اور خدا کی معرفت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اور چونکہ تجرباتی علوم کے متخصص علماء نے اپنی ساری فکری قوتوں کو محسوسات تک محدود کر رکھا ہے لہٰذا غیر محسوس مسائل ان کی فکروں کا بیگانہ سے ہیں۔ اور غیر محسوسات سے یہ بیگانگی اور دوری اور تجرباتی علوم پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ کون و حیات میں ان کے نظریات کی بنیاد اور مبنیٰ تجربہ اور صرف تجربہ ہی ہو گیا۔ اور ان کی نظروں میں معرفت اور قابل قبول صحیح قیاس کا معیار صرف تجربہ ہے اور وہ تمام مسائل کا حل اسی تجربہ سے کرنا چاہتے ہیں — جن علوم کا وظیفہ حوادث و وقائع کے درمیان رابطہ کا بیان ہے، ان کا سارا مقصد یہ ہے کہ خود وقائع کے درمیان رابطہ کو برقرار رکھیں نہ کہ خدا اور وقائع کے درمیان تلاش رابطہ کریں اور انسان جب تجرباتی علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو خدا کی طرف ذرہ بھر متوجہ نہیں ہوتا

اور ظاہر ہے محسوسات کے پہچاننے سے ماورائے طبیعت حقائق کو نہیں پایا جا سکتا اور نہ ہی خدا کو تجربہ گاہوں اور لیبارٹریوں میں ہے بس یہ دیکھا جا سکتا ہے۔ تجربہ گاہوں میں تجربہ کر کے علوم وجود خدا کے سلسلہ میں فیصلہ نہیں کر سکتے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اگر خدا کا وجود کوئی چیز ہوتی تو تجربہ گاہوں اور محاسبات ریاضی سے اس کو دیکھا جا سکتا تھا۔

کوئی بھی تجربہ اپنے تجربہ میں یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ موجود غیر مادی کا وجود ہے یا نہیں ہے؟ کیونکہ تجربہ سے صرف اسی چیز کو ثابت کیا جا سکتا ہے جس کی تجربہ سے نفی کی جا سکتی ہو۔ علم ادر میٹا فزیک اور کالماز (مابعد الطبیعات) معرفت کے دو طریقے ہیں اور ان میں سے ہر ایک متمتع باستحکام و الاصالۃ ہے۔ میٹا فزیک کا اثبات تجربہ سے نہیں کیا جا سکتا لہٰذا تجربہ سے اس کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی اور لاکھوں علمی تجربے یہ ثابت کرنے سے عاجز ہیں: ہر چیز مادی ہے۔ تجربہ گاہوں کے تمام ذرائع — اپنے پیچیدہ و کامل یافتہ ہونے کے باوجود — عناصر غیر معروفہ کی دنیائے تاریک و وسیع تک نہیں پہونچ سکے اور ذرات لا متناہی کے دلوں میں مخفی تمام واقعیات تک رسائی نہیں حاصل کر سکے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے ابھی تک مادہ کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کر سکے تو خالق مادہ کو کیا پہچانیں گے؟

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آفرینش انسان کے نظام دقیق پر مکمل آگاہی کے لئے تجربہ یقیناً بہت مفید ہے۔ بلکہ اسلوب تجربہ کو نظام خلقت کے مطالعہ کے راستے سے ایمان پروردگار کے لئے ایک واضح اور جدید اساس قرار دینا ممکن ہے۔ کیونکہ تجرباتی مسائل کے انکشاف کا نظام خود ایک ایسا محکم اور دقیق نظام ہے جو خالق توانا و علیم کے وجود کی حکایت کرتا ہے۔ مگر چونکہ اسرار عالم اور مسائل طبیعت کی تحقیق میں علمائے طبیعت کا مقصد کبھی معرفت خالق تک پہونچنا نہیں تھا۔ اس لئے وہ وجود خدا کے قائل نہیں ہوئے۔ ان محققین کے علوم کا مرکز صرف اسرار وجود کے کشف کرنے تک محدود رہا ہے اور یہ لوگ اپنے علم کے ایک محدود و تنگ دائرہ سے باہر آئے بغیر اور ظواہر طبیعت کے منظم علاقات کے راستہ سے معرفت کے مرحلہ ثانیہ تک پہونچے بغیر تو احساس و تجربے سے جن چیزوں تک رسائی ہوئی ہے اسکو جمع کرتے ہیں اور پھر عقل و فکر کے لحاظ سے اسکی تفسیر کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں یعنی ایک طرف حس اور تجربہ سے حاصل شدہ اشیاء کو جمع کرتے ہیں اور دوسری طرف عقل و فکر سے نتیجہ نکالتے ہیں اس لئے مقصد اصلی تک یعنی معرفت الٰہی تک نہیں پہونچ پاتے۔

یاد رکھئے علوم مختلفہ اور ان کے باہمی ارتباط و علاقات کے مجموعہ کو دیکھ کر خدائے حکیم کے وجود کا اعتراف کئے بغیر صحیح تفسیر کی ہی نہیں جا سکتی۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ اپنے قواعد و تحقیقات کو خدا سے الگ مستقل سمجھتے ہیں اور اسی کو اپنے تمام امور کا محور بناتے ہیں لہٰذا دیگر مسائل سے بالکل بیگانہ و اجنبی ہو جاتے ہیں۔

اب چونکہ انسان کی عملی زندگی ان علوم سے اتنی مرتبط ہو گئی ہے کہ ان میں جدائی ناممکن ہے، سائنس کے ایجادات نے انسان کے تمام حیاتِ مادی کے اطراف و جوانب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور انسان ان انکشافات سے جو گھٹے میں اتنا گھر چکا ہے کہ وسائل زندگی میں وسائل فطرت و طبیعت کا تلاش کر لینا بہت ہی مشکل ہو چکا ہے، اس لئے فطری طور پر افراد انسانی کا ان علوم پر اعتماد ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وجود خالق و غیبیات کے بارے میں لوگ شک و تردید میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جب منطق علمی اپنے تمام افکار کو اپنے قالب میں ڈھال کر پیش کرتی ہے تو لوگوں کے افکار بھی مسئلہ کون و حیات میں اسی طرز کے ہو جاتے ہیں اور انجام یہ ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہو جاتا ہے کہ کسی بھی امر واقعی کو اسی معرفت علمی کے ترازو پر تولے بغیر قبولا ہی نہیں کرتے۔ مختصر یہ ہے جو چیز دائرہ احساس و تجربہ سے خارج ہو اس کے ثابت کرنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں ہے۔

مابعد الطبیعات کا بہت بڑا ماہر پول کلارنس ابرسولد (PAUL CLARENCE A.) کہتا ہے:-

"میں اپنے ابتدائی دور تعلیم میں علمی اسالیب کا اتنا شیفتہ تھا کہ مجھے یقین تھا ایک نہ ایک دن ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی اور ایک نہ ایک دن فطرت کے اسرار سربستہ فاش ہو کر رہیں گے۔ لیکن میری تعلیم و میرا مطالعہ جتنا جتنا بڑھتا رہا اور ایٹم سے لیکر کہکشاں تک اور میکروبات سے لیکر انسان تک میں نے ہر چیز کا جب مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہونچا کہ ابھی تو بہت سی چیزیں لاینحل رہ گئی ہیں۔ علم میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ وہ ایٹم کے جزئیات کی یا فطرت کے موجودات کی تشریح کر سکے لیکن وہ روح، عقل انسانی کی تعریف کرنے سے عاجز ہے۔ علماء اس بات کو جانتے ہیں کہ اشیاء کی کمیت و کیفیت کا مطالعہ کریں اور بیان کریا

"لیکن وجود اشیا کی علت اور خواص اشیاء کی علت ان کے بس سے باہر ہے۔ علوم یا عقول بشری یہ نہیں بتا سکتے کہ ایٹم، الیکٹران، روح یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ علوم صرف ابتدائے آفرینش عالم کے سلسلہ میں اپنے مفروضات بیان کر سکتے ہیں کہ یہ ستارے، یہ ایٹم، یہ الیکٹران مادہ اولی کے پھٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ مادہ اولیہ، اور اس کے پھٹ جانے کی طاقت کہاں سے آئی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے صاحب عقل، خالق کے وجود کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔"[1]

یہ تجربہ کار عالم جو خدا شناسوں کے افکار سے اجنبی ہے اس زندگی میں تمام ان چیزوں کو قبول کرتا ہے جو منطق علمی کے مطابق ہوں اور جو چیزیں اسلوب علمی کے مطابق نہ ہوں ان کا منکر ہے۔ اسلوب علمی سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف تجربہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کو دلیل بناتا ہے ہر استدلال کی صحت کا دارومدار اس کے نزدیک صرف مطابق تجربہ ہونا ہے۔

ایسا تجربہ کار عالم کہ جسکی مذہبی فکر کی بنیاد مورد غفلت ہو، خصوصاً سادہ دینی و فرعی مسائل و احکام جو امر و نہی کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے پاس بظاہر اپنے علمی مباحث میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے جو کہ تفسیر کر سکے یعنی جس سے وہ عالم ان احکام و مسائل کو سمجھ سکے۔ حالانکہ وہ علمی زبان اور فارمولوں کے عادی ہونے کے سبب علمی اسلوب کا پابند ہے لیکن اس کے سامنے سادہ اور بے تکلف تمام مذہبی احکام بیجا ہیں

یقیناً یہ طرز فکر غلط ہے۔ یہی علوم! کیا ان کے فارمولے پیچیدہ اور دقیق نہیں ہیں؟ اور کیا ان کے سیکھنے والے کے لئے ان دقیق و مشکل مسائل میں غور و فکر کرنا ضروری نہیں ہے؟ یقیناً یہ فارمولے بہت مشکل و دقیق ہیں لیکن اس فن کے علماء جب اسکو عملی زندگی میں پیش کرتے ہیں تو ان مشکل قوالب سے نکال کر اور علمی اصطلاحوں سے الگ کر کے اس کو آسان طریقے سے پیش کرتے ہیں ورنہ یہ علماء اپنے علمی و صنعتی مراکز میں اور کتب خانوں میں محدود ہو جاتے۔

چنانچہ تمام لوگ ٹیلیفون، ریڈیو سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہی صورت دیگر تمام علمی وسائل کی بھی ہے کہ

۱۔ اثبات وجود خدا ص ۲۶

اپنے تمام پیچیدگی و دقتوں کے باوجود ماہرین کی معمولی سی ٹریننگ کے بعد تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ اور جو لوگ ان علمی وسائل کو خریدتے ہیں ماہرین ان کو فنی اور میکانیکی معلومات نہیں بتاتے بلکہ صرف ایجاد کرنے والوں کی تمام زحمتوں اور پریشانیوں کے بدلے چند جملے کہتے ہیں جس سے خریدار اس کو اپنے استعمال میں لانے کا طریقہ سیکھ لے۔

بنابریں اگر ہم ان مذہبی دستوروں کو جو علمی فارمولوں کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ سادہ و عمومی ہیں اپنے غیر صحیح سوابق ذہنی اور تصورات کے قالب میں فرض کر کے ان کی اہمیت و ارزش سے انکار کر دیں اور اپنی زندگی میں ان کے عمیق آثار سے غافل رہیں تو یہ بات انصاف سے اور منطق علم سے بہت بعید ہے۔

یاد رکھئے علمی احکام اسی وقت مفید ہوتے ہیں جب عمومی زبان میں پیش کئے جائیں اور فرد و اجتماع کی زندگی میں سب ہی کے لئے قابل لمس ہوں۔ اس کے علاوہ اگر دینی احکام ہمارے دائرہ اختیار میں ہوں تو پھر کسی نبی یا دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ ہم خود ہی ان کو وضع کر لیا کریں گے۔

اصولاً انسان اپنے مقدورات کے سامنے غیر مقدورات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اسی طرح علمائے طبیعت اور اس کے طلاب علوم تجربیہ میں اپنی معلومات پر مغرور ہو گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انھوں نے عالم حقائق کو مسخر کر لیا ہے۔ حالانکہ کسی زمانہ میں کسی کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے تمام اسرار عالم کا احاطہ کر لیا ہے اور عالم طبیعت کے چہرے سے تمام حجابات اٹھا دیے ہیں۔

واقعیات کو زیادہ وسیع النظری کے ساتھ دیکھنا چاہئے اور وقیانوس مجہولات کے مقابلہ میں اپنے علم کو ایک ناچیز قطرہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ایک علمی انکشاف کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی تو ہمارے سامنے مجہولات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی تاریخ میں انسان نے اپنی زندگی والی تمام قوتوں اور امکانات کو بروئے کار لا کر کائنات کی بیکراں وسعتوں میں جتنی بھی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کی ہے وہ کائنات کے اسرار کثیرہ میں سے صرف چند رموز و اشارے ہی ہیں اور اس سرزمین تحقیق میں انسان نے صرف چند مختصر قدم اٹھائے ہیں اور ابھی تو مجہولات کے پہاڑ ہیں جنھوں نے عقل انسانی کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

پروفیسر ردوایہ کہتے ہیں :-

"تمام وہ انکشافات جو فکر بشری کے لئے ناممکن التصور اور خارق عادت تھے وہ ٹیکنالوجی کے وسعت کی وجہ سے ایک ایسی مدت میں جو دوسو سال سے زیادہ نہیں ہے حاصل ہوتے ہیں اور اجسام و موجودات کی عمروں کے حساب سے یہ دوسو سال کی مدت ایک لحظہ کے برابر بھی نہ ہو گی۔ لہٰذا کسی انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اختراعات بشری کی اس قلیل مدت میں دعویٰ کر سکے کہ وہ اسرار فطرت تک پہونچ گیا ہے یا ان کو مسخر کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ انکشافات بشری ـــ جو دن بدن زیادہ ہوتے جا رہے ہیں ـــ پر حکم لگانے کے لئے ہم کو اس سے زیادہ صبر کرنا چاہئے کم از کم ٹیکنالوجی کی عمر ایک ہزار سال گذر جائے جب کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے یہ ہزار سال بھی کائنات کے لحاظ سے ایک لحظہ سے زیادہ نہیں ہے۔" [۱]

آئن سٹائن کی گفتگو ہمارے مقصد کی موید ہے یعنی ہماری علمی بے بضاعتی جہان ہستی کے بے انتہا اسرار کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :-

"کائنات کی جو تصویر علم کے لحاظ سے بنائی گئی ہے۔ وہ ایک ناتمام تصویر ہے کیونکہ دستگاہ ادراک بشر کے ضعف کی وجہ سے عملاً حقیقت تک رسائی ناممکن ہے ـ اور دنیائے فیزیک کی ناقص تصویر پر اکتفا کرنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو جہان سے مربوط ہو بلکہ زیادہ تر ہم سے وابستہ ہے۔" [۲]

اس لئے میدان علمی شناسائی علوم حسی اور منطقہ فعالیت اور اس کے نفوذ کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے اور حقیقت تک پہونچنے کے لئے ہر قسم کے سوابق ذہنی اور موانعات سے دور ہو کر صحیح فکر کے ساتھ تجزیہ و تحلیل کیا جائے۔

---

۱ دو ہزار دانشمند در جستجوئے خدا از نرگ ص ۲۲

۲ آئن سٹائن کے علمی مقالات ص ۲۲

بے شک علوم تجربیۂ ظواہر کے علاوہ اور کوئی خبر نہیں دے سکتے اور ان علوم کے تحقیقات کا دائرۂ تجربہ گویا
میں صرف مادہ اور مادیات تک محدود ہے۔ اور چونکہ تجرباتی علوم کا مقصد جہان خارج کی تحقیق ہے کہ ہم
مطمئن ہو سکیں کہ قضیہ علمی درست ہے یا نادرست! اس کو جہان خارج سے تطبیق دے کر مقام امتحان میں پیش
کرتے ہیں۔ اگر جہان خارج نے عملاً اس کی تائید کی تو قبول کرتے ہیں ورنہ قبول نہیں کرتے۔ لہٰذا اب علوم
تجربہ کے موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرنا چاہیے کیا حقائق ماورائے طبیعت بطریق حس و
آزمائش قابل تجربہ ہیں؟ اور کونسی تجرباتی تحقیق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ایمان و عقیدہ میں مداخلت
کرے ؟

دانش مادی ایک ایسا چراغ ضرور ہے جو اپنی شعاعوں سے بعض مجہولات کو روشن کر دے لیکن یہ
ایسا چراغ ہرگز نہیں ہے جو ہر قسم کی تاریکی کو دور کرنے میں مفید ہو۔ کیونکہ ہر سسٹم کا پیمانہ اس کے مجموعہ پر
محیط ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اس معرفت سے تعلق رکھتا ہے جو تمام اجزائے تحت تحت کو اس کے
ظرف میں قرار دے سکے اور بینش کلی تک منجر ہو سکے لیکن علوم حسی کے تنگ و محدود حصار کے اندر معرفت
بشری کو قیدی بنا دیا انسان کو بینش کلی تک نہیں پہونچا سکتا۔ بلکہ یہ ایک نمودار تجربی میں توقف ہے اور
باطن ہستی کے جریانات عمیق سے بے خبری ہے۔

خدا پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا علوم تجربہ کے موضوع میں داخل نہیں ہے کیونکہ جب ان علوم کا موضوع
بحث مادہ ہے تو اگر امر غیر مادی ہوگا تو یہ علوم اثباتاً یا نفیاً اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ
دین کے نزدیک خدا تو غیر مادی ہے اور نہ حواس ظاہرہ سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے اور نہ زمان و مکان
اس کا احاطہ کر سکتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جس کا وجود احوال و اوضاع سے مرتبط نہیں ہے وہ
ان اوضاع و احوال کا عالم ہے اور ان سے مستغنی ہے وہ کمال کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہے اور انسانی عقول
کے حیطۂ امکان سے باہر ہے اس کی حقیقت و کنہ ذات کا ادراک نہ کر سکنا ہماری قوت و طاقت کی تقصیر کی
بنا پر ہے اور ہمارے امکان و استعداد سے ماوراء ہے۔

اسی دلیل سے ہم اگر تمام تجرباتی علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو کوئی معمولی سا مورد بھی نہیں ملے گا،

جس میں خدا سے متعلق تجربوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ یا خدا کے سلسلہ میں کوئی حکم لگایا گیا ہو۔ بلکہ اگر ہم دسیوں تنف واقعیات صرف حواس کو مانیں جب بھی ہم اپنے محسوسات سے خارج کے بارے میں نفی کا حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ یہ خود غیر تجربی دعویٰ ہے اور کسی حس تجربی کی طرف مستند نہیں ہے۔

فرض کیجئے قائلین توحید اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہ بھی پیش کر سکیں تب بھی اس خدا کے عدم وجود کا حکم لگانا "جو ماورائے محسوسات ہے" ایک غیر علمی نظریہ ہے بلکہ محض خیال و وہم ہے اور اس طرح کا انکار بے بنیاد بات ہے جو علم و فلسفہ کے شان کے خلاف ہے بلکہ منطق تجربہ کے بھی منافی ہے۔ جارج پولیسٹر (GEORGE POLISTER) اپنی کتاب ۔ اصول مقدماتی فلسفہ ۔ میں کہتا ہے:

ایک ایسی چیز کا تصور جو زمان و مکان سے مستغنی ہو اور تغیر و تحول سے مستغنی ہو نا ممکن ہے۔

ان کلمات میں ایک ایسی فکر کا وجود ہے جس کے بارے میں نہیں معلوم کیا جاتا ہے؟ اور کس چیز کی تلاش ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ کس چیز کی تلاش ہے تو اس کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کس طرح تلاش کیا جائے کیونکہ پولیسٹر کا مرکز تحقیق صرف طبیعت اور محسوسات ہیں لہٰذا جو چیز اس کے علمی میدان سے دور ہے اور تجربہ حسی کے لحاظ سے اس کا وجود قابل اثبات نہ ہو وہ اس کو محال ہی سمجھے گا اور اس کے عقیدہ کو اسلوب فکری علمی کے منافی سمجھے گا۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب معلوم ہے کہ عالم مادہ ــ اپنے تمام اسرار و رموز کے ساتھ صرف اسی کرہ میں محدود نہیں ہے جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور خصوصاً جب کہ اسی کرہ کے مجہولات بشریہ بے شمار ہیں جو عالم طبعی کا مرکز نظر ہے تو پھر علمائے طبیعت کو اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ماورائے طبیعت ہمارے وسائل علمی سے خارج ہے لہٰذا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے صرف سکوت اختیار کرتے ہیں نہ یہ کہ اس کا انکار کرنے لگیں کیونکہ ان کے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ تمام نظام ہستی کے وسعت کے جاننے کے مدعی ہوں جبکہ ان کا علم کائنات کے مقابلہ میں صفر ہے۔

بھلا کون سی دلیل ہے جس کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وجود صرف مساوی مادہ ہے؟ اور کائنات وجود کا انحصار صرف مادیات میں محدود ہے؟ اور ماورائے طبیعت کا منکر کون عالم

ہے جس نے آج تک اپنے انکار کی بنیاد کسی علمی اساس یا منطقی دلیل پر رکھی ہو؟ اور کون سی دلیل یا برہان اس بات پر قائم ہے کہ حدود حس و تجربہ سے جو چیز خارج ہے وہ عدم محض ہے؟ علم اگرچہ بطور قطع و صریح ان تمام مجہولات کا منکر اس لئے نہیں ہے کہ ان تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ شاید کسی دن اس کا انکشاف ہو جائے اس کے باوجود مادی حضرات اللہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرتے حد یہ ہے کہ بطور شک و تردید بھی اس مسئلہ میں بحث کئے بغیر حیلہ بازی اور بر خود غلط انداز سے بطور قطع و صریح خالق کائنات کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہ لوگ مخصوص چیزوں کے لئے کچھ قیاس و معیار قرار دیتے ہیں اور اسی قیاس کو دوسری چیز کے بارے میں قبول نہیں کرتے مثلاً معیار ریاضی کو مخصوص علم کی معرفت میں استعمال کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ لیکن یہی حضرات جب عالم عقلی میں پہونچتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ خدا، روح، دل کو اسی مادی قیاس و دلائل سے سمجھا جائے اور جب ان امور کو ان قیاس سے نہیں سمجھ پاتے اور عاجز ہو جاتے ہیں تو فوراً انکار کر بیٹھے ہیں۔

اگر منطق تجربی میں محصور انسان عالم وجود کے صرف انھیں چیزوں کے وجود کا قائل ہے جو تجارب محسوسہ سے ثابت ہیں اور ان کے علاوہ تمام چیزوں کا منکر ہے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ یہ ایک ایسا راستہ اس نے انتخاب کیا ہے جو تجرباتی علوم کے آزمائش و تحقیقات کا ماحصل نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روشن فکری عصیان فکری کی ایک قسم اور حدود طبیعت و فطرت سے خروج ہے۔ اور علماء الٰہی کے نزدیک جس خدا کو یہ علمائے طبیعت اپنے علمی وسائل اور طبعی اسباب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ خدا ہی نہیں ہے۔ اور مادی علوم اس عظیم مقصد تک پہونچنے سے عاجز ہیں۔

فیزیالوجی کا مشہور عالم ڈاکٹر آیوی کہتا ہے:۔

منطق وجود خدا کو تو ثابت کر سکتی ہے مگر نفی وجود خدا سے عاجز ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ وجود خدا کے منکر ہوں جیسا کہ ماضی میں بھی رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ پر معقول دلیل نہیں پیش کر سکا۔ اگر کسی کے پاس کسی چیز کے وجود

کے انکار پر دلیل عقلی ہو یا کسی چیز کے وجود کے مشکوک ہونے پر دلیل عقلی ہو تو وہ انکار
کر سکتا ہے۔ لیکن میں نے ابھی تک اپنے مطالعہ میں کسی کو نہیں دیکھا جو انکار وجود خدا پر
معقول دلیل رکھتا ہو۔ اس کے برخلاف وجود خدا پر بے شمار اور معقول دلائل دیکھے
ہیں۔[1]

---

[1] اثبات وجود خدا ص۳۲

موجود نادیدہ کا عقیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے!

جس خدائے واحد و یکتا کی طرف انبیاء و رسولوں نے ہم کو دعوت دی ہے کہ اس کی معرفت حاصل کریں اور عبادت کریں، اس کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نامحسوس مطلق ہے۔ ازلی و ابدی ہے ہر جگہ موجود ہے اور کہیں نہیں ہے۔ عالم طبیعت کے تمام محسوسات میں اس کے مظاہر متجسم ہو کر موجود ہیں۔ عالم وجود کے ہر نقطہ میں اس کا ارادہ ظاہر و متجلی ہے اور اس قوت اور ذات عالم کے لئے تمام عوالم طبیعت آئینہ ہیں وہ صرف غیر مرئی ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے حواس اس کے ادراک سے عاجز ہیں کیونکہ جو چیز بھی ہمارے ذہن میں آئے گی وہ محدودیت کے چوکھٹے کے اندر ہی ہوگی مگر خدا مطلق و غیر محدود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایسا موجود جس کو انسانی حواس درک کر سکیں جس میں مادیت کی نشانی و رنگ روپ نہ ہو جو ہمارے مشاہدات و تجربات میں آ نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے بہت دشوار ہے اور انسان جب کسی چیز کو محسوس نہیں کر پاتا تو فوراً اس کا انکار کر دیتا ہے۔

جو لوگ وجود خدا کے مسئلہ کو اپنے محدود فکری چوکھٹے میں اور مادی تنگ نظری میں حل کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں: نادیدہ موجود کا عقیدہ کیونکر ممکن ہے؟ مگر وہ اس حقیقت سے یا تو غافل ہیں یا پھر اس سے تغافل کرتے ہیں کہ: انسان اپنے طبیعی حواس سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ حواس محدود ہیں ـــ صرف اسی دنیا کے ظاہر کا تو ادراک کر سکتا ہے لیکن وجود کے تمام ابعاد کی معرفت پر قادر نہیں ہے اور نہ یہ اپنے حسی آلات کے سہارے ظاہر کے ماوراء ایک قدم آگے بڑھ سکتا ہے، جس طرح خود علوم تجربیہ میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ افکار انسانی کو حدود طبیعت تک پہونچا دے لیکن ماوراء طبیعت تک نہیں پہونچا سکتا۔

اگر انسان علوم و وسائل و مقاییس کے ذریعہ کسی چیز کے ادراک پر قادر نہیں ہے تو جب تک اس کے استقرار اور تسلط پر دلیل قائم نہ ہو جائے صرف اسی بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے مادی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔
لیکن ہم روزانہ قوانین طبیعی کا انکشاف ان مجرد ظواہر سے کرتے ہیں جن کی تفسیر وہی قانون کرتا ہے۔

اور اگر حقائق علمی کا اثبات احساس مستقیم کے بغیر ناممکن ہو تو بہت سے علمی حقائق کا ثبوت اور ان کا علمی ہونا بھی خارج ہو جائیگا۔ کیونکہ ان میں سے بھی بہت سے حقائق حس و تجربہ کے اندر نہیں آتے۔

کوئی بھی عقلمند اپنی روز مرہ کی زندگی میں واقعیات مادیہ کا انکار اس بنیاد پر نہیں کرتا کہ وہ دکھائی نہیں دیتے اور محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہر اس مادی چیز کا انکار کر دیتا ہے جو اس کے احساس کے دائرہ میں نہ آئے تو پھر اس غیر مادی چیز کا انکار کیونکر جائز ہے؟ جو ماورائے ادراک ہے۔

علمی تجربات کے اندر بھی یہ بات مسلم ہے کہ اگر معلول خاص کی علت ہم کو نہ ملے تو ہم فوراً قانون علیت کو باطل نہیں کہہ دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی علت نہیں معلوم ہو سکی: اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ قانون علمی تجربات کی بنا پر مستقل ہے صرف تجربہ میں نہ آسکنے کی وجہ سے نفی علیت نہیں کی جا سکتی۔

اچھا کیا جن چیزوں کو ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے وجود پر عقیدہ رکھتے ہیں سب ہی کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کیا اسی مادی دنیا میں ہم ہر چیز کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں صرف خدا ہی نہ دیکھنے میں آتا ہے اور نہ محسوس ہوتا ہے؟ جی نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے تمام مادی علماء کا اتفاق ہے کہ ہمارے بہت سے ایسے معلومات ان حقائق و قضایا میں داخل ہیں جو نہ محسوس ہوتے ہیں اور نہ اس سے پہلے ہم مانوس تھے۔ کائنات کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو نادیدہ ہیں۔ خصوصاً اس عصر حاضر میں تو کاروان علم نے ایسے بہت سے حقائق کا انکشاف کیا ہے اور سب سے بڑا مسئلہ جو اس زمانہ میں علماء مادی نے حل کیا ہے وہ "تبدل المادۃ بالطاقۃ" کا مسئلہ ہے۔

اسی دنیا کے یہی موجودات اور اجسام جو قابل رویت ہیں جس وقت یہ چاہیں کہ اپنی طاقت کو باقی رکھیں تو اپنی پہلی صورت کو بدل کر طاقت کی طرف بدل جائیں۔ لیکن کیا یہ طاقت جس کی بنیاد پر بہت سے مادی انفعالات کا دارو مدار ہے یہ قابل رویت ہے؟ یا قابل لمس ہے؟

ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ یہ طاقت ایک ایسا منبع ہے جو دارائے قدرت ہے لیکن اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا راز ہے جو ابھی تک مخفی ہے۔ انسان کے بعض علمی نتائج استدلال و برہان کے مرہون ہیں جبکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہو پاتا ہے۔ بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات کی معرفت ان استنباطات کی وجہ سے

ہوتی ہے جن کا دار و مدار مشاہدہ و تجربہ پر ہے ۔ ایٹم کے فیزیکی ذروں کے انطباق کی حقیقت کا سمجھنا صرف دلیل ہی پر موقوف ہے ۔ اگر یہ آثار ظاہر نہ ہوتے تو انسان ایٹمی واقعات و حوادث کے اندرونی حالات سے ہمیشہ جاہل ہی رہتا ۔

یہی بجلی جو آج ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور جس کے بغیر انسانی تمدن دم توڑ دے گا کسی فیزیالوجی نے تجربہ گاہ کے اندر اسکو دیکھا ہے یا الیکٹرانک کہربائی آلات کے استعمال کرنے والوں نے اسکو چھو کر دیکھا ہے کہ یہ نرم ہے یا سخت؟ یا اس کی آواز کو سنا ہے؟ یا اس کے مزہ کو چکھا ہے؟ بلکہ بجلی کے تار میں دوڑتی ہوئی بجلی کو کسی نے نہیں دیکھا بلکہ صرف آلات و تجربات سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس تار میں بجلی ہے یا نہیں ہے ؟ — لیکن نہ دیکھنے کے باوجود بجلی کا کوئی منکر نہیں ہے ۔

جدید فیزیا کا کہنا ہے ، جن چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں وہ سخت و جامد ہیں آنکھوں سے ان میں کوئی حرکت نہیں دکھائی دیتی ۔ لیکن اس کے باوجود جس کو ہم دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں وہ ایسے ذرات کا مجموعہ ہے جو نہ سخت ہیں نہ جامد نہ ثابت ہیں بلکہ یہ ساری چیزیں تحول و تغیر و حرکت میں ہیں ، اور ہماری آنکھوں سے اور ہمارے حس سے جو یہ ثابت و غیر متحرک دکھائی دیتی ہیں ، نہ تو ان میں کسی قسم کی ثبات و پائداری ہے اور نہ سکون و آرام ہے ۔ بلکہ ان کے ارد گرد سیر و حرکت و دوران کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جن کو ہم براہ راست نہیں دیکھ سکتے ۔

جو ہوا ہمارے وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ کافی وزنی اور ثقیل ہے اور بدن ہمیشہ اس کے نیچے دبا رہتا ہے ۔ تقریباً ہر انسان سولہ ہزار کیلوگرام ہوا کو برداشت کرتا ہے اور اگر کبھی بدن کے اندر دباؤ کی وجہ سے اس وزن میں کمی آ جائے تو ہم کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ۔ اب یہ ہوا ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے جس کو گیلیلیو (GALILEO) اور پاسکال (PASCAL BLASE) سے پہلے کوئی جانتا بھی نہیں تھا اور اس کے باوجود ہمارے حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے ۔ پس ہوا بھی ایسا موجود ہے جو دکھائی نہیں دیتی ۔

---

۱ امام زین العابدین ؑ نے صحیفۂ سجادیہ میں اس کی تشریح فرمائی ہے : اے خدا تو پاک و منزہ ہے تو آسمانوں کے

بلکہ حسی تجربات اور عقلی استنباط کی بنیاد پر علماء جن صفات کی نسبت عوامل طبیعت کی طرف دیتے ہیں وہ بھی براہ راست ہمارے لئے قابل درک نہیں ہے مثلاً ریڈیو کی موجیں ہر جگہ ہیں اور کسی جگہ نہیں ہیں یا مادی قوت جاذبہ سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ بغیر اس کے کہ اس مادہ سے کچھ کم ہو یا اس پر کچھ زیادہ ہو۔

تمام علمی تحقیقات کا مقصد مادہ کے محسوس جزئی آثار کا مطالعہ کر کے عوامل مخفیہ اور قوانین عامہ تک پہونچنا ہے علم جیالوجی میں کروڑوں سال پہلے طبقات زمین کے تشکیلات کے بارے میں خبریں دی جاتی ہے اور پورے یقین کے ساتھ طبعی عوامل سے سطح زمین میں پیدا ہونیوالے نشیب و فراز طبقات زمین کی حد بندی، آثار قدیمہ کو بہت دنوں میں وسیع اور پھیلے ہوئے اوقیانوس، شورہ زار زمین کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان انکشاف کرنے والوں میں سے ایک شخص بھی زمین پر ہونے والے ان حادثات و واقعات کا نہ دیکھنے والا ہے اور نہ ہی اس کا عینی گواہ ہے۔

ہمارے ذہن میں آنے والے مفاہیم مثل عدالت، خوبصورتی، محبت، عداوت، بغض، علم کی کوئی مشخص و معین صورت نہیں ہے اور نہ یہ دکھائی دینے والی چیزیں ہیں اور نہ ان کا کوئی فیزیاوی اثر ہے اس کے باوجود ان کو امور واقعیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ الیکٹرک کی ماہیت الاسکی حرارت، ایٹم کو انسان نہیں جانتا۔ اسی طرح الیکٹرون و نیوٹرون کو صرف ان کے آثار و نتائج سے پہچانا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ چیزیں بھی نہیں آتیں — تو پھر خدا کو آثار سے پہچاننے میں کیا پریشانی ہے؟

اچھا، زندگی کا تو وجود ہے اور ہم اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے! لیکن بھلا کس وسیلہ و ذریعہ سے حیات کی اندازہ گیری کی جا سکتی ہے؟ فکر و خیال کی سرعت رفتار کو کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟

پروفیسر ستانلی کونگدان (SITANLY CONDGON) لکھتا ہے: "میں نے اپنے شاگردوں سے کہا

سے وزن کو جانتا ہے۔ اے خدا تو پاک و منزہ ہے جو زمینوں کے وزن کو جانتا ہے اے خدا تو پاک و منزہ ہے تو آفتاب و ماہتاب کے وزن کو جانتا ہے۔ اے خدا تو پاک و منزہ ہے ظلمت و نور کے وزن کو جانتا ہے اے خدا تو پاک و منزہ ہے تو سایہ اور ہوا کے وزن کو جانتا ہے۔ صحیفہ سجادیہ دعا ۵۵۔

کیا وہ قوانین کو عملی تفکیر پر تطبیق کرنے کا طریقہ لکھو۔ مجھے اس کا طول سنٹیمیٹر میں، اس کا وزن کیلوگرام میں، اس کا رنگ، اس کی شکل، دباؤ، اندرونی کشش، فاعلیت، جہت حرکت و سرعت کو مجھ سے بیان کرو۔ لیکن وہ اندیشہ و فکر کو کسی فیتہ یا وزن یا تعبیر ریاضی معادلہ سے بیان نہیں کرسکے۔ ہاں اگر کوئی نیا لغت لکھا جائے جس میں فیتہ یا وزن کا طول و وزن کے مخصوص معنی تحریر کئے جائیں تو اور بات ہے۔

علم معرفت ایک آزمودہ علم ضرور ہے لیکن وہ بھی معرض اشتباہ و گمراہی میں ہے۔ زندگی میں اپنے مخصوص حدود کے علاوہ نہ اسمیں کوئی قانونیت ہے اور نہ صحت۔ توضیح و پیشگوئی کے لحاظ سے وہ مکمل طور سے معلومات کمیتی کے حصار میں محصور ہے۔ اور اسکی ابتداء و انتہاء احتمالی ہے یقینی نہیں ہے۔ اور اس کے نتائج بھی خصوصاً ارتباطات بین الظواہر مختلف تقریبی ہیں اور ظن و تخمین کی غلطی سے مبرا نہیں ہیں۔ وقتی اور غیر یقینی ہیں اکثر اوقات جدید معلومات کی وجہ سے تغیر پذیر بھی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ علمی استنتاج کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک عالم کہتا ہے: زمانہ حاضر تک کے اطلاعات تخمین و خیال ہیں۔ ظواہر طبیعت کے لحاظ سے ہمارے تحقیق اور ادراکات محض نسبتی اور محدود ہیں۔ اس دنیائے عجیب و پر تلاطم میں کوئی ایسی واقعیت نہیں ہے جو بغیر کسی شرط کے وجود و فعالیت خدا کی نفی کرسکے یا اس کے عدم کو ثابت کرسکے۔[1]

اس بناپر یہ بات نہایت ہی واضح ہے کہ غیر مرئی اور غیر محسوس کا انکار کرنا منطق اور عقلی اصول کے برخلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین خدا کیوں اس قاعدہ کو جو تمام مسائل علمیہ میں معمول بہ ہے صرف خدا کے بارے میں اس کا انکار کرتے ہیں؟

در اصل یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ ہم ابعاد مادہ کے چوکھٹے میں محصور و محبوس ہیں اس لئے موجود مطلق کا تصور مادی توجہ کے ساتھ کر ہی نہیں سکتے۔ مثلاً ایک دیہاتی سے اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کے اندر ایک ایسا شہر بھی ہے جو بہت وسیع اور لاکھوں آدمی کی رہائش پر مشتمل ہے اور اس کا نام لندن ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسا گاؤں آئیگا جو اس کے گاؤں سے دس بیس گنا بڑا ہو

۱۔ اثبات وجود خدا ص ۴۳

لیکن اس کی عمارتیں، وہاں کے لباس، معاشرت، روابط کے بارے میں اس کا تصور یہی ہوگا کہ وہاں کے لوگ بھی ہمارے ہی گاؤں کی طرح ہوں گے۔

لندن سے ناواقف افراد کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ لندن ایک آبادی ہے لیکن اس طرح کی نہیں جیسا کہ تم سوچ رہے ہو اور نہ وہاں کی وضع تمہاری یہاں کے وضع کی طرح کی ہے۔ اسی طرح ہم پروردگار عالم کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ موجود ہے زندہ ہے قادر ہے، علیم ہے لیکن ان موجودات اور ان قدرتوں کی طرح نہیں ہے۔ اس طرح ہم کسی حد تک دائرہ محدودیت سے خارج ہو سکتے ہیں اور یہ بات تو مادہ پرست بھی جانتے ہیں کہ مادہ اولی کی حقیقت و ذات کا تصور ناممکن ہے۔

گرچہ ہماری نظر میں یہ محسوسات ہماری واضح اور دقیق ترین معلومات میں شامل ہیں لیکن علمی اور فلسفی مسائل میں تنہا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بلکہ تعصب کی عینک اتار کر ان کی حقیقت و ماہیت اور کشف حقائق کے سلسلہ میں وہ انسان کی کتنی مدد کر سکتی ہیں اس بات کی تشخیص ضروری ہے ورنہ یہ محسوسات ہم کو گمراہی و ضلالت سے دوچار کر دیں گے کیونکہ حسی ادراکات ظواہر محسوسات کی مخصوص و معین کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسی ادراکات کا تعلق نہ تو تمام ظواہر محسوسات سے ہوتا ہے اور نہ ہی اشیائے غیر محسوس سے ان کا تعلق ہوتا ہے یہ صرف محدود دائرہ کے اندر ہی درک اشیاء پر قادر ہیں۔

اب آپ اپنی آنکھوں کو لے لیجئے کہ واقعیات کے درک میں سب سے مضبوط ذریعہ ہے مگر بہت سے مقامات پر حقیقت کے دیکھنے میں غلطی کرتی ہے۔ یہ انوار کا مشاہدہ صرف اسی وقت کر سکتی ہے کہ جب طول موج ۴ فی صد میکرون سے کم اور ۸ فی صد میکرون سے زیادہ نہ ہو اسی لئے ماورائے بنفشی اور ماورائے قرمز کے نور کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اور علمی کتابوں میں حواس کی غلطیوں کے لئے ایک مخصوص باب قائم کیا گیا ہے۔ ہم جن رنگوں کو اس دنیا میں دیکھتے ہیں یہ در حقیقت رنگ ہی نہیں ہیں بلکہ امواج مختلف کے طولانی ارتعاشات کا نام ہے۔ پس جس چیز کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں وہ حدود قدرت میں محدود ہوتا ہے۔ مثلاً بعض حیوانات گائے، بکری بعض واقعیات کو مختلف رنگوں میں دیکھتی ہیں۔

اگرچہ ابھی تک ازروئے تحصیل علمی یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ انسان کے حسِ بینائی میں مختلف رنگوں کے ادراک کی کیا کیفیت ہے؟ اور اس سلسلہ میں جو تحقیقات اب تک دنیا کے سامنے آئی ہیں یا جو نظریات ظاہر ہوئے ہیں وہ مفروضات سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ رنگوں کی رویت کا مسئلہ بھی اسی طرح مبہم و پیچیدہ ہے۔

قوتِ لامسہ کا فریب اگر دیکھنا ہو تو تین برتنوں میں پانی بھر دیجئے ایک میں بہت گرم پانی ہو۔ ایک میں بہت سرد پانی ہو اور ایک میں گنگنا پانی ہو اس کے بعد ایک ہاتھ کو گرم پانی میں ڈالئے اور دوسرے کو سرد میں پھر دونوں کو ایک ساتھ نکال کر گنگنے پانی میں ڈال دیجئے تو آپ کو عجیب و غریب احساس ہوگا۔ ایک ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ سردی اور دوسرے میں ضرورت سے زیادہ گرمی کا احساس ہوگا۔ حالانکہ پانی ایک ہے اور درجۂ حرارت بھی مشخص و معین ہے یہ لامسہ کا فریب ہوا کہ نہیں؟ لیکن عقل و منطق کہتی ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں پانی گرم بھی ہو اور سرد بھی ہو اور اس میں دو متضاد صفتیں پائی جائیں۔ یہ در حقیقت قوتِ لامسہ کی خطا ہے کہ جو پہلے والے پانی میں ہاتھ ڈالنے کی وجہ سے اپنے کنٹرول سے خارج ہو گئی ہے اور فعلاً یہ حس حقیقت کے برخلاف ہے جس کی غلطی پر عقل و ذہن متوجہ کرتے ہیں۔

ایسی حالت میں عقل کی رہبری اور مقیاسِ فکری کے بغیر صرف حس پر کیونکر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ اور حس کی غلطیوں سے بچانے کے لئے ادراکِ عقل کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ عقل کا حکم ہے جو اصلاحِ حواس کی ذمہ دار ہے اور جو حواس سے بلند و بالا ہے۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ محسوسات واقع بینی ارزش نہیں رکھتے۔ صرف ارزشِ عملی رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے مطالعات میں صرف حواس پر تکیہ کرتے ہیں وہ مسائلِ ہستی اور معمائے آفرینش کے حل پر کبھی بھی موفق نہ ہوں گے۔

حواس کے واقع نمائی کی قدرت کے سلسلہ میں جو کچھ ہم کو معلوم ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عالمِ حس و تجربہ میں بھی تنہا حواس انسان کو علمِ یقینی تک پہونچانے پر قادر نہیں ہیں پھر بھلا ان مسائل میں جو حواس کی پہونچ سے ماوراء ہیں انھیں حواس کی رہبری کر سکتے ہیں؟

مادہ، ماورائے طبیعت کے پیرو اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس طرح علومِ حسیہ میں تحقیق

دمعرفت کا طریقہ تجربہ ہے ، اسی طرح مسائل مابعد الطبیعات میں انکشاف حقیقت کا ذریعہ و وسیلہ عقل ہے ۔

مشہور محقق ــــ کامیل فلاماریون ــ اپنی کتاب "اسرار الموت" میں تحریر کرتا ہے :

انسان جہل و نادانی کی وادی میں زندگی بسر کر رہا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ انسان کی جسمانی ترکیب حقائق تک رہبری نہیں کر سکتی ۔ اور یہ حواس بیچگانہ انسان کو ہر چیز میں دھوکہ دیتے ہیں تنہا وہ چیز جو انسان کو حقائق تک پہونچا سکتی ہے وہ صرف عقل و فکر و دقت علمی ہی کا ہے ۔

آج انسان کی عقل و دانش کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ایسے ذرات و طاقت کا وجود ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے اور نہ ان کا کسی حس سے ادراک کیا جا سکتا ہے ۔ پس اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ بہت سی چیزیں اور ایسے زندہ موجودات پائے جاتے ہوں جو ہمارے حواس کے دائرہ اختیار سے خارج ہوں ۔

لہٰذا جب یہ بات دلیل قطعی سے ثابت ہوگئی کہ حواس ظاہری میں تمام موجودات کے شناخت کی طاقت نہیں ہے بلکہ یہ حواس کبھی تو ہم کو فریب دیتے ہیں اور خلاف واقعہ کی نشاندہی کرتے ہیں تو ہم کو یہ کبھی تصور نہ کرنا چاہئے کہ تمام موجودات صرف انہیں موجودہ میں جن کا ہم احساس کرتے ہیں اور جس کا ہم احساس نہ کر سکیں وہ موجود ہی نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے برخلاف کا عقیدہ رکھنا چاہئے ۔

جس طرح پہلے لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہر جسم میں کروڑوں میکروبات موجود ہیں اور ہر زندہ جسم میں ان کی جولانگاہ ہے ۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جو چیز واقعیات کی طرف ہماری رہبری کر سکتی ہے وہ صرف اور صرف عقل و فکر ہے ۔

CAMILLE FLAMMARION ؎

اصل علیت

اصل علیت ایک عمومی قانون ہے۔ انسان کے تمام مسائل علمی یا عادی کی بنیاد ہے۔ کوئی بھی حادثہ خواہ طبیعی ہو یا اجتماعی علماء اس کی علت تلاش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں کیونکہ علماء و دانشمند حضرات کبھی بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ خود بخود علت و معلول کے بغیر کوئی چیز پیدا ہو جائے۔

عالی جہات پر علماء اور دانشمند حضرات کی تحقیقات نے ان کو یہ صلاحیت عطا کر دی ہے کہ طبیعت کے حاکم قوانین نظام کو بہتر طریقے سے پہچان سکیں اور علوم و صناعات میں جتنی جتنی ترقی ہوتی گئی وہ قانون علت و معلول کے پابند ہوتے گئے۔ یہ علاقہ علیت و معلولیت اور یہ کہ کوئی بھی حادثہ صحن عالم میں اس وقت تک قدم نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے لئے کوئی علت نہ ہو یہ قوی ترین عقلی دلیل اور فکر بشر کی واضح صورت ہے اور یہ ایک ایسا فطری و طبیعی امر ہے کہ ہمارے ذہن میں اپنے فعل و انفعال کو آٹومیٹک طریقہ سے انجام دیتا ہے۔

غیر متمدن انسان بھی حوادث و ظواہر کی علت کا متلاشی رہتا تھا لیکن چونکہ علمی وسائل سے محروم تھا اس لئے ان حوادث کی نسبت ناپاک روح یا پاکیزہ ارواح کی طرف دیا کرتا تھا اور خود اہل فلسفہ نے انسان کی سرشت و باطن سے مفہوم علیت کا استنباط کیا ہے اور ان مفاہیم کو فلسفہ کے قالب میں ڈھالا ہے۔

مادیین کے برخلاف ہم ـــ جو مادہ کی چہار دیواری میں محصور ہیں ـــ نے اپنی زندگی میں کسی چیز کو اتفاقاً پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ طول تاریخ میں کسی کے سامنے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ بغیر علت کوئی چیز خود بخود اتفاقی طور سے عالم وجود میں آجائے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہوتا تو مادیین کے

نظریہ کے لئے دلیل بن سکتا تھا کہ کائنات دفعتاً اتفاقی طور سے پیدا ہو گئی ۔

دقت و حساب و تعادل اس فاعل کے قدرت و ارادہ و فکر کا نتیجہ ہے جو اپنے عمل کو کسی مخصوص مقصد کے بنیاد پر بجا لاتا ہے ۔ اور جو چیز عامل غیر عاقل کے ہاتھوں موجود ہوتی ہے اس میں ہر گوشہ سے ہرج و مرج و لاقانونیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اب آپ سوچئے بھلا یہ کون سا تصادف ہے جس کے نتیجہ میں طلوع ہستی سے اب تک ایسا عجیب و غریب، دقیق و منظم نظام موجود ہے؟ کیا اتنا مکمل نظام صدفۃً و تصادفاً ہو گیا ہے؟

مجھے بتائیے کس مادی یا انسانی علم میں یہ بات دیکھی گئی ہے یا کسی نے دعویٰ کیا ہے کہ بغیر علت و سبب کوئی چھوٹی سی چیز بھی خود بخود موجود ہو گئی ہے! سلسلہ علت و معلول کا لا الی نہایۃ باقی رہنا اور علت اولیٰ کا نہ ہونا یا انکار علت کا مجوز ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا مجوز ہو سکتا ہے کہ سیڑھی کے پہلے زینہ کو آخری زینہ قرار دے دیا جائے ۔ اگر یہ کائنات عمیق حکمت ارادۂ عالمہ اور تدبیر سنجیدگی کا نتیجہ نہ ہوتی اور ایک منظم نظام کے تحت نہ چل رہی ہوتی تو ابتدائے آفرینش ہی سے ہر لحظہ نابودی و ویرانی کے خطرہ میں ہوتی ۔ کیونکہ اگر کوئی واقعہ اتفاق کی بنیاد پر ناگہانی طور سے زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں رونما ہوتا تو نظام عالم کیلئے اس اتفاق کا وجود بہت ہی مساعد ہوتا ۔ کیونکہ نظام میں یا توازن عناصر میں تھوڑا سا خلل اور قوانین علم میں معمولی سا رخنہ اجرام سماوی کے ٹکرانے کیلئے کافی ہے ۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں عالم کا فنا ہو جانا بدیہی ہے ۔

اور اگر پیدائش عالم بر بنائے تصادف ہے تو پھر یہ مادی حضرات وجود کائنات کی تفسیر ایک محکم نظام و مکمل تدبیر پر —— جس میں کسی اتفاق کو دخل نہ ہو —— کیوں نہیں مانتے ہیں؟

اگر پوری کائنات تصادف و اتفاق کا نتیجہ ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو تصادف کی بنیاد پر موجود نہیں ہوئی؟ اگر کوئی موجود تصادف کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے وجود میں آیا ہے تو اس کے ممیزات و خصوصیات کیا ہیں تاکہ ہم تحقیق کریں اور دیکھیں کہ کیا وہ اس دنیا میں مختلف ظواہر و شئون پر منطبق ہوتا ہے کہ نہیں؟ حالانکہ نظام ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جس کا وجود اتفاق پر مبنی ہو ۔ بلکہ کارخانۂ آفرینش کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فکر و تدبیر و دقت کا نتیجہ نہ ہو اور آثار کے یہی خصوصیات ہماری رہبری موثر کی خصوصیات کی طرف کرتے ہیں۔

اگر نظام و توازن کا خالق اتفاق و صدفہ ہوتا تو جتنی بھی چیزیں ہندسہ و دقیق حساب پر مبنی ہیں سب کے سب غیر منسجم اور نا ہماہنگ ہوتیں کیونکہ ہندسہ و دقیق حساب اتفاق و صدفہ کے ضد ہیں اسی لئے ہم کہا کرتے ہیں صدفہ و اتفاق کو نظام عالم کی اساس قرار دینا کسی منطقی برہان اور علمی دلیل سے نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اور نہ نظام وجود کے لئے بطور آخری علل کے قبول کیا جا سکتا ہے۔

اگر لفظ صدفہ کا استعمال بعض مسائل میں ہوتا بھی ہے تو وقتی اور عدم معرفت کی بنا پر ہوتا ہے آگاہی وعلم کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اور جب تک حوادث پر حاکم قانون ـــ یعنی علت و معلول ـــ کا انکشاف ہو جائے اس لفظ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مستمر علمی تحقیقات کے نتیجہ میں پیچیدہ حوادث کی علت و حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو اس لفظ کو طاق نسیان میں رکھ دیا جاتا ہے اسی لئے ہم سمجھتے ہیں کہ تصادف کی تعبیر ایک آخری علمی فیصلہ نہیں ہے۔ شناخت علمی اور نظام جہان کے کشف رموز کے بعد اس لفظ کے لئے کوئی مجال باقی نہیں رہتی۔

یورپی نہضت علمی کی ایک برجستہ شخصیت فرانسیس بیکن (FRANSIS BACON) کہتے ہیں: میرے لئے یہ تو ممکن ہے کہ تمام افسانوں پر ایمان لاؤں لیکن یہ ہرگز نہیں مان سکتا کہ اس کائنات کی بنیاد بدون علم و شعور رکھی گئی ہے۔ ایک سطحی فلسفہ تو ذہن بشر کو الحاد کی طرف لے جا سکتا ہے لیکن فلسفۂ عمیق انسان کو ہمیشہ دین کی طرف لے جائیگا۔ کیونکہ اگر کسی نے نزدیک علت کو دیکھا اور گہرائی میں نہیں گیا تو ممکن ہے کہ وہ خدا کا قائل نہ ہو۔ لیکن اگر تمام سلسلہ علل و معلولات کو نظر میں رکھے گا تو بہرحال مشیت ازلی اور خدائے واحد پر ایمان لائے گا۔[1]

یہاں پر مشہور ریاضی دان نیوٹن ـ NEWTON اور انگریزی کے مشہور منجم کی ایک دوست سے گفتگو کو نقل کرنا بہت مناسب ہے۔ نیوٹن (NEWTON) نے ایک ماہر مکینک اور خوش ذوق آدمی سے نظام شمسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ (ماڈل) بنانے کو کہا اس ماڈل میں ایک ستارہ دل کا مرکز اور متعدد ستارے بنائے گئے تھے لیکن یہ ستارے چھوٹے چھوٹے گیند کی طرح کے تھے اور بجلی کے تاروں سے ایک دوسرے سے مرتبط تھے اور ایک چھوٹے سے ہینڈل کے ذریعہ

---
[1] تاریخ فلسفہ ویل ڈورانٹ ص ۱۲۳

ان تمام ستاروں کو اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے پر آمادہ کر دیا جاتا تھا اور یہ سارے ستارے اس مرکز کے اردگرد گھومنے لگتے تھے۔

ایک دن نیوٹن (NEWTON) اپنی میز کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا وہ مکینک دوست بھی پاس ہی بیٹھا تھا جس نے یہ نظام شمسی بنایا تھا اتنے میں نیوٹن (NEWTON) کا ایک دوست جو علمائے مادیین میں سے تھا ناگہانی طور پر آگیا اور جس وقت اس کی نظر اس مصنوعی "نظام شمسی" پر پڑی اس کی خوبصورتی اور دستکاری کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا اور جب اس چھوٹے سے ہینڈل کو حرکت دے کر تمام سیاروں کو مرکز کے گرد متحرک دکھایا گیا تب تو وہ اپنے تعجب کو چھپا نہ سکا اور بول اٹھا بھائی اس خوبصورت چیز کو کس نے بنایا ہے؟ نیوٹن نے کہا کسی نے نہیں بنایا یہ تو اتفاقی طور سے وجود میں آگیا۔ عالم مادی نے کہا میرے دوست تم نے میرے سوال کو نہیں سمجھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے سامنے رکھا ہوا نظام شمسی کو کس ماہر مکینک نے بنایا ہے؟ نیوٹن "NEWTON" نے کہا برادر میں نے آپ کا سوال حرف بحرف سمجھ لیا ہے۔ اس کو کسی مکینک نے نہیں بنایا بلکہ اس کے قدرتی اور مواد اولیہ اتفاقاً جمع ہوگئے۔ اور اس صورت میں بن گئے۔ دانشمند مادی نے ایک ایسی نظر سے دیکھا جس میں حیرت و خفگی کی باتیں تھیں اور بولا میرے دوست نیوٹن: تمہارا خیال ہے کہ میں بیوقوف ہوں؟ کہ اس جیسی نادر و نایاب چیز کے بنانے والے کو مادہ کی طرف نسبت دوں! اسی وقت نیوٹن نے اپنا مطالعہ روک کر کتاب بند کی اور میز کے کنارے سے نکل کر اپنے دوست کے پاس آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا میرے دوست: یہ چیز جو تم دیکھ رہے ہو اور اس کے بنانے والے کے بارے میں پوچھ رہے ہو سوائے ایک چھوٹے سے ماکیٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں، اس کو ایک مخصوص سسٹم کے ذریعہ بنایا گیا ہے تم اس کے لئے تیار نہیں ہو کہ یہ خود بخود بن گیا ہے اور یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس کا بنانے والا دانا و آگاہ نہیں تھا۔ لیکن پورا نظام شمسی اپنی تمام عظمت و

ے تھوڑا ردوبدل

وہ وسعت اور پیچیدگی کے باوجود بغیر کسی بنانے والے کے خود بخود بن گیا ہے اور مادہ کی کارفرمائی ہے اور اسکی آفرینش اتفاقی ہے! دانشمند مادی نیوٹن کے معقول دلیل کے سامنے لاجواب ہوگیا اور اس پر ایک گہری خاموشی چھاگئی اور اس کے ذریعہ وہ ماہر فنکار جو مادی عقائد رکھتا تھا اور حقیقت سے کنارہ کش تھا وہ بھی لاجواب ہوگیا۔

اصالت نیروی حیات

آج کا علم یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ زندگی زندگی کو ایجاد کرتی ہے ۔ زندوں کی زندگی ہمیشہ توالد و تناسل کے ذریعہ باقی و مستمر رہتی ہے ۔ آج تک کوئی ایسا خلیہ نہیں دیکھا گیا جو بے جان چیز سے پیدا ہوا ہو ۔ حد یہ ہے کہ کیڑے مکوڑے کے چھوٹے تک انگران کا پیدا کرنے والا دارائے حیات نہیں ہے تو چاہے وہ جہاں بھی ہو کسی دوسرے کا خالق نہیں ہو سکتا ۔

آج کا علم کہتا ہے : اس کرۂ زمین پر ایک طولانی زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ فوق العادت گرمی کی وجہ سے اس پر نہ زندگی کے آثار تھے نہ سبزے کا وجود تھا اور نہ نہریں اور چشمے تھے بلکہ اس کی فضا پگھلی ہوئی دھاتوں اور آتش فشانوں سے پر تھی اور پھر جب پشت زمین سرد ہو گئی تب بھی لاکھوں سال تک اس پر مواد غیر آلی کے علاوہ کسی جاندار کا وجود نہیں تھا ۔ مختصر یوں سمجھئے کہ سطح زمین پر ہونے والے تغیرات کے درمیان کسی زندگی کا وجود نہیں تھا تو پھر اس روئے زمین پر زندگی کیونکر آئی ؟

محققین کا خیال ہے کہ زمین کی پیدائش کے تین ارب سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد حیات کا وجود ہوا ہے لیکن اس نے اپنے آغوش میں کتنے رازوں کو رکھا ہے اور کیا کیفیت تھی یہ کچھ معلوم نہیں ہے ؟ سیکڑوں سال گزر گئے جب سے علماء و محققین راز حیات کو کشف کرنے کے لئے اپنے تجربہ گاہوں کی چہار دیواری میں مطالعات سعی و کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس معمہ کے حل میں ناکام ہیں ۔

جرمنی کا مشہور محقق و دانشمند برونو بورگ BROTO BORAG اپنی کتاب " العوالم البعیدہ " میں تحریر کرتا ہے : زندگی ! کتنا سحر آفرین کلمہ ہے ! کیا وجود عدم سے پیدا ہوا ہے ؟ کیا مواد آلی مواد غیر آلی سے وجود میں آ سکتے ہیں ؟ یا یہاں پر کسی قادر مطلق پیدا کرنے والے کا ہاتھ کارفرما ہے ؟

کبھی یہ بات کہی جاسکتی ہے ممکن ہے دوسرے اجرام فلکی سے ہمارے سیارہ میں زندگی آگئی ہو ؟ کیونکہ زندہ جیکروبات نباتی جو کسی فلکی کرے میں گردش کرتے کرتے بہت اونچے اٹھ گئے ہوں اور فشار کے نتیجہ میں سورج کی شعاعوں نے ان کو کسی ایسے فضائے افلاک میں پھینک دیا ہو جو اس کرہ کی سطح تک پہونچ گئے ہوں اور وہاں نشوونما پاکر تکامل کی صورت اختیار کر گئے ہوں!

ان مفروضات کے باوجود اس معمہ کے حل میں سر مو ذرا بیش رفت نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی ظہور زندگی کی کیفیت خواہ کوئی ایسا سیارہ ہو جو ہمارے نظام شمسی کے تابع ہے یا شعرای یمانی کے تابع ہے ـــ ہمارے لئے مجہول ہے اور غیر واضح ہے۔

جس طرح فنر، چرخی، وغیرہ کے اکٹھا کر دینے سے گھڑی نہیں چلا کرتی اسی طرح جب تک محرک حیات اور "زندہ ہو جا" کی صدا مفقود ہو گی زندگی ناممکن ہے۔

اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ مادہ دارائے زندگی نہیں ہے اور کوئی بھی مادی عنصر تنہا زندگی کی خاصیت نہیں رکھتا اس لئے یہ فرض کرنا کہ مادے کے ذرات کے تشکل کے نتیجہ میں زندگی آجاتی ہے ناممکن ہے۔ کیونکہ پھر ہمارے سامنے یہ سوال منہ کھولے کھڑا ہے کہ زندہ مادہ تناسل و تولید کے علاوہ کسی اور صورت سے مکرر اور تکثیر پذیر کیوں نہیں ہوتا ؟ زندہ اجسام میں برابر کیمیاوی فعل و انفعال کا سلسلہ باقی ہے۔ اس کے باوجود رمق حیات کا ان میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اب ہی یہ بات کہ مادہ ترکیب کی طرف تمایل رکھتا ہے اور اس کے دورہاے تطور و تکامل میں زندگی جوش کھاتی ہے تو یہ زندہ حوادث کے مظاہر کی توصیف ہے جس کو ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت وجود حیات اور اس کے سبب کی معرفت کا بیان نہیں ہے۔

ذاتی طور پر اجزائے مادہ میں کوئی اختلاف تو تھا نہیں پھر آخر بعض اجزاء تو دوسرے مرکب ہوئے اور بعض اجزاء دوسروں کے ساتھ مرکب نہیں ہوئے، بعض اجزائے مادہ دارائے حیات ہوئے اور بعض دیگر محروم رہے آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ یہ تفاوت کہاں سے پیدا ہوا اور معیار نسبت میں اس اختلاف کی علت کیا ہے ؟

دو یا چند مختلف عناصر سے مل کر جو چیز حاصل ہوتی ہے اسمیں یہ بات ہوتی ہے کہ ایک عنصر کے اندر جو خاصیت ہوتی ہے وہ دوسرے کو بخش دیتا ہے لیکن جو فاقد خاصیت ہے وہ کیونکر دوسرے کو بخش سکتا ہے! البتہ عناصر مرکب ہونے کے بعد ان میں ایک خاصہ عمومی پیدا ہوجاتا ہے جو بہرحال فرداً فرداً عناصر مرکب کے خواص سے خارج نہیں ہوتا۔ لیکن حیات کے جو منفرد خصوصیات ہیں ان میں اور مادہ کے خصوصیات میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ کیونکہ حیات کے لئے جو تجلیات ہیں وہ مادہ کے لئے ہرگز نہیں ہیں اور بہت سی حیات مادہ پر حاکم ہے اگرچہ صورت و شکل میں مادہ مادہ کے تابع ہے۔ لیکن پرتو حیات جوں ہی مادہ پر چمکتا ہے اسی وقت حرکت و جنبش، مادہ اور آخر کار ادراک و معرفت متجلی ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی کی تفسیر فعل کیمیاوی کے رد عمل سے کرنا غیر معقول ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے: کارخانوں کی طرح زندگی جامد و بے روح سسٹم کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا سسٹم ہے جس میں قدرت تکرار اور اپنے لئے قوت تجدید ہے اور اگر تعبیر درست مانی جائے تو اپنے اوپر تفوق و برتری بھی رکھتی ہے اور اس کے اندر ایک فطری و طبیعی ہادی و مرشد ہے جو اندر سے اس کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔

آخر یہ کون سا عامل ہے جو مادہ کو مختلف انواع میں منظم پروگرام کے ماتحت بناتا رہتا ہے جو جسم کے اندر اپنی جگہ بنالیتا ہے، مادہ منویہ کے اندر آباؤ اجداد کی خصوصیات کو بلا استثناء اور بغیر کسی غلطی و خطا کے بیٹوں کے اندر منتقل کر دیتا ہے۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ زندہ خلیات کی ترکیب میں بھی خصوصیات ہوتی ہیں مثلاً کمیوں کو پورا کرنا، تلف شدہ کو پھر نئے سرے سے بنادینا، استعداد التنوع اور حفظ النوعیت وغیرہ۔ انسانی بدن میں جس وقت عمل کرنا چاہئے ہر سیل اسی وقت بہت ہی شائستہ طریقے عمل کرتا ہے۔ تقسیم کار اور اپنے وظیفہ پر عمل حیرت انگیز ہے۔ بدن کے بنانے کے لئے بقدر ضرورت تقسیم ہوجاتا ہے اور ہر خلیہ اپنی جگہ پر دماغ، ریہ، جگر، دل، گردہ میں پہونچ جاتا ہے۔ پس ایک جسمانی عمارت میں نظم و انتظام کے بعد خلیات کے حیاتی وظائف میں کسی قسم کا قصور نہیں ہوتا غیر مفید اور فاضل مادہ کو ختم کردیتا ہے۔ اور مکمل طور سے جسم متناسب کی حفاظت کرتا ہے۔

اس حیرت انگیز تقسیم بندی ـــــ جو اجسام موجودات میں اجزاء لازمہ و متناسبہ کی موجد ہے۔

کی نسبت ناآگاہ و میکانیکی عوامل کی طرف دنیا بہت ہی ناقص ہے۔ پھر بھلا کون سا انسان جو حریت فکر کا مالک ہوگا اس منطق کو قبول کرے گا۔؟

اسی لئے ہم کہتے ہیں: حیات و زندگی ایک ایسا نور ہے جو اس مادہ سے — جو جاندار جسم کی استعداد رکھتا ہے — بالاتر افق سے چمکتا ہے اور اس کو جنبش و حرکت پر آمادہ کرتا ہے۔ اور یہ اسی خدائے علیم و حکیم و قادر و خبیر کا ارادہ ہے جو زندگی کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ بے جان مادہ پر افشا کرتا ہے۔ اور حقیقت میں وہ آگاہ انسان مادہ متحرک و مسیر کے درمیان حیات کے رشتہ ثابت کو دیکھتا ہے اور خدا کو خلاقیت کے جلوہ میں مستمر مشاہدہ کرتا ہے۔

فطرت میں خدا کے جلوے

خداوند عالم کی معرفت کے لئے دنیائے مادہ (طبیعت) بعنوان مصنوع بہترین و روشن ترین اور عمومی دلیل ہے۔ اور یہی مادہ تحولات خدا کے حکیمانہ ارادہ کے کاشف ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی عادلانہ شعاعوں میں سے یہ بھی ہیں جو موجودات کو مدد و زندگی بخشتا ہے اور تمام موجودات اپنے وجود و ترقی میں اس سے کسب فیض کرتے ہیں۔

خدا کی معرفت کے لئے دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فلسفی جس کے ذریعہ اس حقیقت مطلق تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے اور عقیدہ میں مضبوطی آسکتی ہے اور شناخت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

پر پیچ طریقہ استدلال تو صرف دانشمندوں کے لئے لذت آفرین ہو سکتا ہے۔ لیکن کتاب آفرینش کے اسرار اور دنیا کے گوناگوں موجودات کا مطالعہ خود گواہ ہیں کہ اس کی خلقت میں عقل عالی کی دخالت ہے کی ب موجودات کا مطالعہ بھی اس خدا سے جو خالق و حکیم ہے اور پورا نظام کائنات اپنی تمام عظمت و وسعت کے ساتھ جس کے مظاہر قدرت کا معمولی سا جز ہے پر ایمان لانے کے لئے اگرچہ دلیل و برہان کا محتاج ہے مگر یہ برہان اتنا سادہ و بسیط ہے کہ جس میں فلسفی دلائل کی گتھیاں نہیں ہیں اور ایک طرح سے یہ راستہ تمام لوگوں کے لئے کھلا ہے۔ جس سے ہر مفکر، عالم، عامی استفادہ کر سکتا ہے۔

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق تمام مظاہر قدرت میں آثار ترکیب و توازن و تدبیر کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اس کو ہر ذرہ میں وجود مبدء پر محکم و قوی دلیل مل سکتی ہے۔

اگر ایک سادہ آدمی بھی کسی حیوان کے بدن پر غور کرے تو اس کے اعضاء اور ہڈیوں کی

خصوصی ترکیب اور ظاہری حال کو دیکھ کر یقین کریگا کہ یہ دقیق نظام یہ محاسبات و تقادیر کا تحقق کسی عظیم قدرت کاملہ و علمیہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایک عالم فیزیولوجی انسان نظر کے ساتھ جب دل و جگر و معدہ اور وصول غذا کے نظام کو دیکھتا ہے تو اس کو علم و قدرت لا متناہی کے آثار بخوبی دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ سادہ آدمی اور عالم فیزیولوجی کے غور و فکر کا طریقہ ایک نہیں ہوگا ایک کا دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ علماء نے علم کی جو جو میاں سر کی ہیں اور فطرت کے رازہائے سربستہ کے کھولنے کے لئے جو اقدام کئے ہیں اور نظام کائنات کے حیرت انگیز و تعجب خیز معرفت کیلئے جو قدم اٹھائے ہیں ان کا تقابل عام آدمی سے نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ دونوں عالم و متخصص سادہ — کے مطالعہ کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

عالم طبیعت کے لا متناہی اسرار کا مطالعہ کرنے والے تجرباتی علوم سے ہر شخص کے مستفید ہو سکنے کے باوجود ان علوم میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ عجائب خلقت اور فطرت پر حاکم مخصوص نظام کی معرفت انسان کو خالق کائنات کی معرفت کے ساتھ اس کے صفات کمال جیسے علم و قدرت متناہی کی شناسائی بھی عطا کرتی ہے۔

یہ دقیق نظام — جو مختلف امور کے درمیان مناسب و معقول رابطہ کے برقراری کا نام ہے — حیوانات، نباتات، زمینوں، آسمانوں، کروں، پہاڑوں، سمندروں، ایٹموں کے اندر اسکی وسیع حکمت پر دلالت کرتا ہے خواہ از روئے ابداع و ایجاد دیکھا جائے یا اس کی مصنوعات میں چھوٹی سے لیکر بڑی تک چیزوں میں جو علم و قدرت ودیعت کی گئی ہے، اس کو مطالعہ کیا جائے۔

بنیادی طور پر علمی لحاظ سے مادہ کی خود سازی محال ہے۔ اور مادی نظریہ کہ "جہان مادی ہمیشہ تحول اور پیشرفت کی طرف پیش روی کرنے میں مشغول ہے۔" بھی عقلی میزان اور فطری واقعیات کے مخالف ہے — بلکہ جمادات کے اندر ہونیوالے تمام تحولات یا تو خارجی قوت کے زیر اثر ہوتے ہیں یا اجسام مختلفہ میں داخلی تبادل کا نتیجہ ہوتا ہے — اور نباتات کے اندر ہونیوالے تحولات اور ان میں نمو و توسیع بارش، شعاع شمس، اور زمینی تغذیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح عالم حیوانات میں بھی یہی صورت ہے اس میں حرکات ارادیہ کا اضافہ بھی ہے۔

ان موارد مذکورہ میں اشیاء موجودات کا انسجام و ہم کاری جو خارج کے ساتھ واضح و روشن ہے۔ اور ان چیزوں کے باطن میں جو اثر و خواص ودیعت رکھے گئے ہیں اور جو قوانین و فارمولے ان کے لئے لازم قرار دیئے گئے ہیں مجال نہیں ہے کہ کوئی موجود اس پر لازم کئے گئے قانون کی مخالفت کر سکے۔

انسان اپنے حواس کے ذریعہ جن واقعیات کا ادراک کرتا ہے اس کے مختلف خصوصیات ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ موجودات عالم متغیر و متحول و غیر ثابت ہیں۔ ایک مادی موجود اپنے تمام دورہ ہستی میں یا تو بستر رشد و تکامل پر برقرار ہے اور یا پھر فرسودگی و انحطاط کی طرف مائل ہے مختصر یہ ہے کہ کائنات ہستی میں کوئی بھی موجود مادی ثابت و برقرار اور ایک حالت پر نہیں ہے۔

محدودیت بھی موجود محسوس کے خصائص سے ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لیکر بزرگ ترین کہکشانوں تک ہر چیز زمان و مکان کی محتاج ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ بعض چیزیں بزرگ ترین مکان یا طولانی زمان پر مشتمل ہیں۔ اور بعض چیزیں مختصر مکان مختصر زمان پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مادی موجود اصل ہستی کے لحاظ سے اور کمالات کے لحاظ سے نسبی ہے۔ قدرت و عظمت و زیبائی و دانائی بلکہ چیزوں کی ہر صفت دوسری چیزوں کے اعتبار سے نسبی ہے۔

اسی طرح موجود محسوس کی خصوصیت تعلق و احتیاج بھی ہے۔ ہم جس موجود کو بھی فرض کریں وہ کچھ دیگر امور سے مشروط و متعلق ہوگا۔ اس لئے وہ ان شروط کا محتاج کہلائے گا۔ اس دنیا کے اندر کوئی ایسی مادی چیز نہیں ہے جو بالذات ہو اور غیر سے مستغنی ہو۔ لہٰذا فقر و احتیاج تمام مادی موجودات کو محیط ہے۔

حواس کے برخلاف انسانی عقل و فکر جو حجاب ظواہر عبور کر کے ہستی کے اعماق میں نفوذ کر جاتی ہے وہ کسی طرح بھی ہستی کو امور نسبی و محدود و متغیر و محتاج میں منحصر ماننے پر تیار نہیں ہے۔ بلکہ فکر انسانی ایک ایسے وجود کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے جو دائمی حقیقت اور غنی مطلق ہو اور وہ

حقیقت ایسی ہو جو تمام زمانوں اور مکانوں میں حاضر و موجود اور تمام موجودات اسی کی طرف مستند ہوں۔ کیونکہ پورے کا پورا عالم بذات خود موجود نہیں ہو سکتا۔

پس معلوم ہوا کہ عالم ایک ایسی حقیقت مستقلہ کا محتاج ہے جو نہ قید بردار ہو نہ کسی پر معلق ہو اور کسی غیر مشروط ہو بلکہ وہ تمام امور مشروط و محدود و نسبی کی حفاظت کنندہ ہو اور ہر چیز اس حقیقت کی محتاج ہو کہ اس کے وجود کو ہستی سے پر کرے۔ خلاصہ یہ کہ ہر موجود میں اس کی حیات و دانائی و قدرت و بے انتہا حکمت کی نشانی موجود ہو۔ اور انھیں موجودات کو دیکھ کر اس حقیقت کے بارے میں تحقیقی معلومات حاصل کر سکیں اور ہر فرد حق جویائے حقیقت شخص اس طریقے سے وجود خالق پر دلیل قائم کر سکتا ہے۔

مادہ اور قوانین وجود

مادہ اور قوانین وجود کے درمیان لازمی تقابل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مادہ مستغنی ہوگیا ہے بلکہ مادہ سے مختلف اقسام کا پیدا ہونا اور ان کے درمیان شدید ارتباط و تلازم سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ خود اپنے وجود میں چند سنن و قوانین کا پابند ہے جو اس کو ایک نظم و سسٹم میں پیرو قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وجود دو اساسی عناصر پر موقوف ہے ایک مادہ اور دوسرا نظم و ضبط اور ان دونوں میں مستحکم قسم کا ارتباط ہے اور مادہ اور نظام کے مستحکم ارتباط کی وجہ سے جہان متناسب کا وجود ہے۔

جو لوگ مادہ کو بے نیاز مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ مادہ خود اپنا خالق ہے اور اپنے لئے اس نظام کو پیدا کرنیوالا ہے وہ لوگ بھلا یہ کیونکر قبول کر سکتے ہیں کہ ہیڈروجن و آکسیجن اور الیکٹرون اور پروٹون نے خود ہی اپنے کو پیدا کیا ہے اور پھر یہی چیزیں دیگر موجودات کے وجود کا سرچشمہ بنی ہیں اور پھر انھیں چیزوں نے کچھ ایسے قوانین بنائے ہیں جو خود ان چیزوں پر اور تمام عالم مادی پر حاکم ہیں۔

مادہ پرست حضرات کا خیال ہے کہ اشیاء پست موجودات عالیہ کی پیدائش کا سرچشمہ ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ مادہ جب اپنے اوج کمال کی حالت میں اپنے کو ایجاد کرنے سے یا قوانین عالم کی نافرمانی کرنے سے عاجز ہے تو اپنے ضعیف پستی کی صورت میں اپنے ایجاد کرنے یا نظام وجود دینے کی بجائے پر کیونکر قادر ہو سکتا ہے؟ لہٰذا یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ پست مادہ موجودات عالیہ کا خالق ہے یا یہ کہ اس کو زندگی بخشنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

جدید سسٹم میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ با مقصد زندہ عناصر سے مرکب سسٹم یا معین پروگرام کی بنیاد پر خارج سے منظم شدہ سسٹم سے مرکب نظام میں یہ امکان ہے کہ ان کا تحول تکامل ہو سکے

ہر سادہ سسٹم یا مرکب جو خارجی امداد و ارتباط کا محتاج ہو اور جو خود اپنی ساز ندگی پر قادر نہ ہو وہ تمام موجودات کا خالق کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ تمام سسٹموں کا مجموعہ بھی جب تک ارادہ، توانائی و شعور کا دارا نہ ہو وہ نہ قدرت ایجاد رکھ سکتا ہے اور نہ ہی کامل و متحرک دستگاہ کا ادارہ کر سکتا ہے!

"قانون — حساب الاحتمالات — میں یہ بات مسلم ہے کہ عمومی حرکت جو غیر منظم ہو وہ صرف تفرق و پراگندگی پیدا کرتی ہے اور ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔

"قانون احتمالات اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ دنیا کی پیدائش اتفاقی طور سے ہو گئی ہے بلکہ نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ اس کو نامعقول و ناممکن بھی سمجھتا ہے اس کے برخلاف قانون احتمالات ریاضی دنیا کے لئے ایک صحیح قیادت اور دقیق پروگرام کی ضرورت کو لازمی بتاتا ہے۔

"قانون احتمالات نے "پیدائش عالم اتفاقی ہے" کے ماننے والوں کے منہ پر بھرپور طمانچہ مارا ہے۔ اگر بعض چیزوں کی خلقت کو اتفاقی مان لیں — تو اگرچہ یہ بات بہت بعید ہے — مگر ناممکن نہیں ہے لیکن ایک ایسے عالم کے بارے میں جو نہایت ہی متوازن و منظم اور باریک بینی پر مبنی ہے۔ اس کا وجود اتفاقی مان لینا محال ہے۔ اور نظام وجود میں جزئی اور سادہ قسم کے تغیرات کا ہونا عالم کے اتفاقی وجود پر ہرگز دلیل نہیں ہے۔

اگر فطرت خود بخود حالت ترکیب و تشکیل میں آ گیا تھی تو اب اسباب تغیر میں کوئی اختلاف کیوں نہیں ہوتا۔ اور اب عمیق آ تو نیک قسم کے تحولات کیوں نہیں رونما ہوتے؟

آج بھی دنیا میں حیرت انگیز واقعات جو ہوتے ہیں وہ خود اس حقیقت کی راہنمائی کرتے ہیں کہ اس حیرت انگیز تحولات کے پیچھے کوئی عالم و دانا طاقت موجود ہے جو کائنات کے اندر ایک اور عجب خیز نظام کو بروئے کار لاتی ہے اور عالم آفرینش میں شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ اور کنٹرول و تنظیم کا نقشہ ہستی پر ترسیم کرتی ہے۔

فطرت کے کروڑوں مظاہر میں یہ ہماہنگی اور ارتباط اور زندگی سے ان کے رابطہ کی صرف ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کے لئے ایک خالق فرض کریں کہ جس نے اس

کرو فضا میں اپنی غیر محدود وسیع انتہا قدرت کے ذریعہ مختلف عناصر کو زندہ رکھا اور ہر ایک کے لئے ایک معین پروگرام مرتب کیا اور یہی توجیہ فطرت کے تمام ظواہر میں ارتباط و توازن سے مطابقت رکھتی ہے؛

اور اگر اس توجیہ کو قبول نہ کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہ احتمال دیں کہ انواع ظواہر بدیعہ میں یہ ارتباط و انسجام اتفاقی طور سے بغیر کسی مقصد کے قائم ہے؟ اور یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ وہ مادہ کہ جو ان صفات و اوصاف میں اس خدا کے مساوی ہے جو عالم و دانا مدبر و قادر مطلق ہے؟

اگر یہ کائنات — جس میں محیر العقول عجائب ہیں اور عقل بشر اس کے حیرت انگیز اور خوارق کے درک سے عاجز ہے — موجود نہ ہوتی اور دنیا صرف ایک ایسے موجود میں منحصر ہوتی جو صاحب خلیہ واحدہ ہوتا تب بھی اس موجود حقیر کے اتفاقی وجود اور نظم و ضبط کا احتمال، احتمالات کے حساب کی بنیاد پر [illegible] کے محاسبات کے مطابق — ایک ایسی ریاضی رقم تک پہونچتا ہے جس کے استیعاب پر خود فکر انسانی قادر نہ ہو سکتی۔

"باشمیل" (BASHMIL) کہتا ہے — اے مادہ پرستو تم لوگ زمین و سورج کی حرکات دوار اور پورے نظام شمسی کے قائل ہو اور یہ بھی اعتراف کرتے ہو کہ علم ریاضی ایک مضبوط اور خطا بردار نہیں ہے اس کے باوجود ان حرکات اور متحرکات کبیرہ و عظیمہ و دقیقہ و محکمہ و منظمہ کے پیچھے کسی مدبر طاقت کے قائل نہیں ہو تو تم کو یہ کہنا چاہئے کہ اس نظام شمسی نے خود اپنے کو پیدا کیا ہے اور اپنے لئے ایسا پیچیدہ نظام بنایا ہے جس نظام کے مطابق وہ حرکت کرتا ہے اور گھومتا ہے اور پھر اپنے لئے ایک ایسا معین و دقیق دستور بنایا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کسی دوسرے سے نہ ٹکرا سکے اور یا پھر اپنی اس سرسام آور سرعت میں ایک ایسا مانع بنا دیا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کبھی کسی سیارہ سے ٹکرا ہی نہ سکے — میں یقینی طور پر کسی باہوش آدمی کے لئے یہ نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہوگا؟ یہ تو کوئی دیوانہ ہی عقیدہ رکھ سکتا ہے۔

دوطرفہ توازن

تمام اجزائے وجود اور موجودات ہستی اپنی داخلی ترکیب میں اور ایک دوسرے سے روابط میں ایک مضبوط نظام کے تابع ہیں۔ ان کی ترکیب اور باہمی رابطہ کچھ اس قسم کا ہے کہ ہر ایک عنصر کو اس کے مقصد اور پیش نظر خط سیر میں مدد دیتا ہے۔ اور ہر موجود اپنے اس رابطہ کے ذریعہ جو دیگر موجودات سے رکھتا ہے اپنے ہدف و مقصد کی طرف خود سیر کر سکتا ہے۔

علوم مادی کا سب سے بڑا کارنامہ اس دنیا کے ظواہر و کیفیت کی شناخت ہے۔ لیکن مخلوقات کی ماہیت و حقیقت کی شناخت علوم مادی کے دسترس سے باہر ہے۔

مثلاً ایک دانشمند فلکی زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ فضا میں کروڑوں کرات موجود ہیں بعض ثابت ہیں اور بعض متحرک ہیں اور یہ بتا سکتا ہے کہ قوت جاذبہ سیاروں کو آپس میں ٹکرا جانے سے روکے ہوئے ہے اور ان کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور آلات کے ذریعہ سیاروں کا زمین سے فاصلہ زمین کی سرعت رفتار اور سیاروں کا حجم بتا سکتا ہے لیکن ان تمام تجربوں کا نتیجہ صرف سطح فرضی کے ظواہر کی تفسیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قوت جاذبہ کی حقیقت اور مرکزی طاقت کی ماہیت اور ان کی پیدائش کی کیفیت بتانے سے یہ علوم مادی عاجز ہیں۔

مادی علماء سیارہ اور مشین کی تفسیر تو کرتے ہیں لیکن ان کا محرک کون ہے؟ اس کی تفسیر نہیں جانتے۔ اسی لئے مادی علوم ان کروڑوں حقائق سے ناواقف ہیں جو طبیعت اور نفس انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ یہی انسان جو ذرات کے باطن تک پہنچ گیا ہے وہ ایک ذرہ حیاتی کے پیچیدہ اسرار و غوامض کے مقابلہ میں عاجز ہے۔ مختصر یہ ہے کہ علوم مادی کے ماہرین ان اسرار کے کشف و تسخیر سے درماندہ رہ گئے ہیں۔

آفرینش ہستی کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دو طرفہ توازن ایسی دو چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے ہم زمانہ بھی نہیں ہیں۔ اور یہ ہم آہنگی ایک ایسی کیفیت ہے کہ جس کا تعین ابھی سے ایک آنے والے کے لئے کر دیا گیا ہے۔

اس ہم آہنگی کا بہترین نمونہ مادر و فرزند میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ماں — خواہ وہ کسی انسان کی ہو یا کسی دوسرے جاندار کی ہو — کے حاملہ ہوتے ہی دودھ کے ہرمونات اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں اور بچہ جتنا جتنا رحم مادر میں بڑھتا جاتا ہے یہ ہارمون بھی روبہ افزائش ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب وضع حمل کا زمانہ آجاتا ہے تو مولود کی غذا دودھ کی صورت میں — جو بچے کے تمام جسمانی احتیاج کے مناسب ہوتا ہے — تیار ہو جاتی ہے۔ اور یہ پہلے سے تیار شدہ غذا بچہ کے ضعف ہاضمہ کے لیے بہت ہی مناسب ہوتی ہے۔ اور ایک پوشیدہ و مناسب خزانہ — پستان — میں محفوظ رہتی ہے۔ اور یہ خزانہ بچہ کی پیدائش سے سالہا سال پہلے ماں کے جسم میں ودیعت کر دیا جاتا ہے اور غذا کو آسان بنانے کے لئے پستان کے نوک میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو جاتے ہیں جو بچہ کے دہن کے لئے نہایت موزون ہوتے ہیں کیونکہ بچہ میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ یکبارگی دودھ اس کے گلے میں انڈیل دیا جائے بلکہ ان سوراخوں کے ذریعہ اپنی غذا چوس چوس کر تکمیل کرتا ہے۔ بچہ جتنا جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی حساب سے شیر مادر میں تغیرات پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اطباء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نومولود بچہ کے لئے اس عورت کا دودھ قطعاً نقصان دہ ہے جس کے یہاں ولادت کو ایک مدت گزر چکی ہو۔

یہاں پر قدرتاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مستقبل میں آنے والے موجود کے لئے بہت پہلے سے ایک دوسرے موجود میں اس کی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے کیا یہ عمل ایک پیش بینی اور دقت و تدبیر پر مبنی نہیں ہے؟ اور یہ مستقبل بینی اور عجیب و غریب حکمت ایک قادر و توانا عالم و مدبر کے بغیر ممکن ہے؟ اور کیا یہ قدرت بے پایاں کی دلیل نہیں ہے؟

تمام مشینی اور صنعتی وحدتوں میں جو محاسبہ اور دقت ہم دیکھتے ہیں یہ ان افکار و اعمال کا نتیجہ ہے جو ان کی تنظیم و ترکیب میں استعمال کئے گئے ہیں اور نہیں عینی مشاہدات کے بموجب ہم

ایک ہی فلسفی نتیجہ تک پہونچ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی حساب و موازنہ کی بنیاد پر کوئی نظام ترکیبی پایا جائے وہاں ہم کو ضرور غور کرنا چاہئے کہ اس کے پیچھے کوئی عقل و فکر و ارادہ یقیناً کارفرما ہے۔

جو مخصوص باریکی ہم صنعتی مصنوعات میں دیکھتے ہیں، موجودات طبیعت اور ان کی ترکیب و تالیف میں اس سے کہیں زیادہ دقیق تر اور شگفت انگیز تر دیکھتے ہیں۔ بلکہ جو تدبیر متعدد و برتر ہم طبیعت میں دیکھتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی انسانی مصنوعات اور بشری افکار میں نہیں پایا جاتا۔

لہٰذا جب ہم — بغیر کسی شک و تردید کے — اپنے صنعتی نظام کو افکار و ارادے کا نتیجہ مانتے ہیں تو کیا ہندسہ و محاسبات دقیقہ کے جھروکوں سے طبیعت میں عقل و ارادہ اور لامتناہی علم نہیں دیکھ سکتے؟

علم طب کا کارنامہ

آج کے دور میں علم طب اپنے ترقی کے اس دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں ایک انسان کے پہلو سے اس کا گردہ نکال کر دوسرے انسان کے پہلو میں ــــ جس کا گردہ خراب ہو گیا ہو اور قریب مرگ ہو ــــ لگا دیا جاتا ہے۔ طب کی یہ ترقی کسی ایک طبیب کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ ہزاروں سال کے اطباء کے تجربات کی میراث ہے۔

پس درحقیقت یہ کامیاب آپریشن صدیوں کے تجربات کا نقطہ آخر ہے پہلے کے حکماء نے اس کے مقدمات فراہم کئے اور اب نتیجہ ظاہر ہوا۔ یعنی حکماء کے چند ہزار سالہ افکار و خیالات کو اکٹھا کرنے کے بعد گردوں کا کامیاب آپریشن ہو سکا ہے۔

کیا یہ کام علم و دانش کے بغیر انجام پا سکتا تھا؟ بدیہی طور پر جواب منفی طور پر ملے گا۔ مفکرین اور انسانی طاقتور دماغ نے جب چند ہزار سال تلاش و جستجو کی تب گردوں کا نقل و انتقال ممکن ہوا۔

یہاں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک کار کا ٹائر کھول کر اسکی جگہ دوسرا ٹائر لگا دیں تو ٹائروں کا بدلنا زیادہ اہم کام ہے یا ٹائروں کا بنانا دونوں کاموں میں کس کام کے لئے زیادہ علم و دانش کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ٹائر بنانا زیادہ مہارت چاہتا ہے۔

اسی طرح دنیائے طب میں گردوں کا بدل دینا چاہے کتنا ہی اہم معاملہ ہو لیکن گردوں کا خلق کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جیسے ٹائر بدلنے سے زیادہ ٹائر بنانا مشکل ہے۔

آپ بتایئے وہ کون سا عقلمند ہے جو یہ فیصلہ کرے گا کہ ایک گردے کا بدلنا ہزاروں سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن خود گردے کا بنانا کوئی اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک فطری بات ہے جس کے پاس دو پیسوں والی عقل بھی ہو گی وہ بھی گردہ خلق کر سکتا ہے کیا کوئی صاحب عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے؟

کیا طبیعت کی خلقت کے لئے ایک عقل مدبر کا وجود فرض کر لینا ایسے مادہ کو خالق فرض کر لینے سے بہتر و قریب تر نہیں ہے کہ جو مادہ عقل و شعور ہی نہ رکھتا ہو اور نہ اسمیں ابداع و اختراع کی صلاحیت ہو؟

یقیناً خالق کی حکمت پر ایمان و عقیدہ عقل و منطق سے کہیں زیادہ قریب ہے بہ نسبت اس کے مادہ غیر مدرک و غیر واعیہ جو تدبیر کے قابل نہیں ہے اس کو خالق مانا جائے کیونکہ تمام وہ خصائص و اوصاف فعلیہ جو اس دنیا کے خالق کے لئے ثابت ہیں ان کو مادہ کے لئے کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے مثلاً خالق عالم مدبر و ارادہ والا ہے اور مادہ میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں!

آئنسٹائن (EINSTEIN) اپنی کتاب ــــ "جو دنیا میں دیکھ رہا ہوں"[1] ــــ میں تحریر کرتا ہے "ایک عالم مصلح عالم وجود کے لئے قانون علیت کا عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس دانشمند کا مذہب کیا ہے؟ اس کا مذہب ایک تحیر متعجب اور ہے جو کائنات کے عجیب و دقیق نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ نظام جس کے بعض اسرار کا پردہ کبھی کبھی اٹھ جاتا ہے اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام مساعی اور منظم بشری افکار اس دقیق نظام کے مقابلہ میں شکل مبہوت تصاویر کے ہیں۔

---

[1] دنیائی کہ من می بینم

طبیعت کی ظرافت کاریاں

ذرا ایک ملیریا کے مچھر کو اپنے پیش نظر رکھئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام آلات تجربہ آپ کے پاس ہوں! نہیں نہیں صرف عادی و معمولی نگاہ ڈال کر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اس حقیر سی چیز میں کتنا پیچیدہ اور دقیق نظام کارفرما ہے! اس عجیب و غریب موجود کے اندر و باہر تمام ضروری آلات و وسائل موجود ہیں مثلاً نظام ہضم، نظام گردش خون، سلسلہ اعصاب، دستگاہ تنفس، یہ ساری کی ساری چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اس کے اندر ایک باقاعدہ و آراستہ تجربہ گاہ موجود ہے جو بڑی دقت و سرعت کے ساتھ اپنے ضروری مواد کو اکٹھا و مہیا کرتی ہے۔ آپ کی بڑی بڑی تجربہ گاہیں کس قدر ہیں! اور ان کے بنانے میں انسانی، فکری، اقتصادی، طاقتیں کتنی صرف ہوئی ہیں؟

اپنی تجربہ گاہ کا اس مچھر کے تجربہ گاہ سے مقابلہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ آپ کی تجربہ گاہ میں وہ دقت و ظرافت ہرگز نہیں ہے جو مچھر کے تجربہ گاہ میں ہے۔ کتنے غور و فکر اور تجربوں کے بعد ایک مچھر کے کاٹنے کا علاج تلاش کیا گیا ہے یہ سب لوگ جانتے ہیں۔

اگر آپ کوئی کام انجام دینا چاہیں تو اس کے لئے ہر طرح کی فکر و دقت نظر ضروری ہوتی ہے تو پھر جب آپ اس عالم مصنوع میں اس دقت و مہارت کے ساتھ اس نظام محکم کو ملاحظہ فرماتے ہیں تو کیا یہ بذاتہ عقلی حکمت الٰہیہ بالغہ کی سند نہیں ہے؟

اگر ہم اس کائنات کو — جس میں باریک بینی، منصوبہ، اور منظم حرکت ہے — ایک مادہ جامد کی مخلوق مان لیں تو کیا یہ بھی علمی معرفت کی دلیل ہے؟ بلکہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک مکمل نظم و ضبط کا پتہ دیتی ہیں نہ کہ ان سے بے مقصدیت ہرج و مرج و بے نظمی کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر طبیعت میں کبھی ضعف نقاط دکھائی دیں تو یہ کتاب خلق الٰہی میں نقص کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی

وجہ ہمارے افکار و ادراک کی مقصد اصلی تک نارسائی ہے اور عالم اسرار و رموز کے سمجھنے سے ہماری عقلوں کی کوتاہی ہے۔

اگر ہم ایک عظیم دستگاہ میں ایک چھوٹے سے پیچ کے مقصد کو نہ سمجھ سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم انجینئر کو نادان وجاہل کہنے لگیں بلکہ دراصل یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم اس پیچ کے مقصد کو نہیں سمجھ سکے۔

کیا تصادف واتفاق فریضۂ علم کو پورا کرسکتے ہیں؟ اور علم بھی ایسا کہ جہاں ذرہ برابر جہالت وشک کا شائبہ بھی نہ ہوا! اگر بقول مادہ پرست وہ کائنات جس میں ایجاد واختراع کی ہر موجود میں بھرمار ہے اس کا خالق ایسا مادہ ہے جس میں علم وارادہ کا کوئی دخل ہی نہیں ہے تو پھر انسان اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت تحصیل علم میں کیوں لگاتا ہے؟ اسکو تو چاہئے کہ طبیعت وفطرت کے ساتھ رہ کر مزید جہالت میں اضافہ کرے۔ جو حقیقت اس قدر [illegible] مرتب اور بے انتہا منظم افعال وانفعالات کی ہدایت ورہبری کرے اس کے ارادہ وہدف کا انکار ناممکن ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ گمان کرلیا جائے کہ مسلسل ان افعال وانفعالات کا تحقق الٰہی ارادہ کے بغیر ہے۔

سالہا سال کے تھکا دینے والے علمائے کیمیا کے پروگرام اور لاکھوں تجربات کے بعد یہ حضرات اس قابل ہوئے کہ بہت تھوڑے سے آلی وآزمائشی مواد کو بہت ہی سادہ و ابتدائی طریقے سے اس طرح ترکیب دے سکیں کہ جس میں حیات کا اس کا تھوڑا سا بھی اثر نہیں ہے۔

اتنی سی علمی کامیابی کو بڑی اہمیت دی گئی اور مجالس علمیہ میں اس کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ موجود بہت ہی ناقص اور بالکل ہی ابتدائی تجرباتی دور میں اتفاق سے ہوگیا ہے اس میں کسی دقت و برنامہ و توجیہ کو دخل نہیں ہے — لیکن یہی مادہ پرست علماء تمام موجودات کو اندھے مادہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے واقعہ یہ ہے ایسا طریقۂ فکر منطق وافکار وعقل انسانی پر صریحی ظلم ہے اور حقیقت سے دشمنی ہے۔

ذرا چھاپہ خانہ میں دیکھئے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر حروف چینی کرنے میں کتنی زحمت اور دقت سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی جب دوبارہ تجدید نظر کرتے ہیں تو بعض غلطیاں مل جاتی ہیں جو معمولی سی غفلت کی وجہ سے

ہوگی نہیں اب اگر حروف چینی کرنے والا مختلف حروف کو لیکر ترتیب وار لگانے کے بجائے کسی چیز میں سارے حروف اکٹھا کر کے صفحہ پر ایک مرتبہ الٹ دے تو کیا حروف و کلمات و معانی کے لحاظ سے پورا صفحہ بغیر کسی غلطی کے مرتب و منظم ہو کر ہمارے سامنے آسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔

اس سے بھی زیادہ کمزور بات اس شخص کی ہے جو یہ کہے: ایک ٹونٹی سے پگھلا ہوا تانبہ قطرہ قطرہ سو کلو گرا اور اس سے خود بخود حروف بن گئے اور پھر ایک آندھی چلی جس سے ایک معدنی صفحہ پر یہ حروف ترتیب وار خود بخود جم گئے اور اس طرح ایک ہزار صفحہ کی کتاب جو دقیق علمی مباحث اور شیریں و جذاب عبارت پر مشتمل تھی بغیر کسی نقص و کمی کے وجود میں آگئی۔ کیا کوئی بھی صاحب شعور اس نظریہ کو قبول کرسکتا ہے؟

مادہ پرست علماء فطرت کے ان حروف سے بنی ہوئی مختلف و متنوع تصاویر کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور آسمانی کرات اور طبیعی موجودات اور تمام متحرک سیاروں کے بارے میں یہ مادہ پرست کیا کہتے ہیں؟

رتھر فورڈ (RUTHERFORD) ایک مشہور عالم کہتا ہے: کاربن، آکسیجن، آزٹ[1] اور ہیدروجن کے ذرات کا دقیق پروٹینی وحدت کے لئے جمع ہو جانا ناقابل تصور ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ ترہ تاش کے پتوں کو قفس میں اڑا دیں اور پھر کہیں کہ یہ منبر پر خود بخود ترتیب کے ساتھ آکر جمع ہوگئے۔ یہ قطعی محال ہے — اور اگر یہ عمل بشریت کے طول تاریخ میں دو مرتبہ ایک سکنڈ کے لئے بھی دہرایا جاتا تب بھی یہ تخلیق مصدقہ ناممکن ہوتا۔

کیا حروف تکوین — ایٹم اور اس کے تشکیل دہندہ اجزاء[2] — کی اہمیت چھاپ خانہ کے حروف سے کم تر ہے؟ کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ یہ منظم و پرمعنی حروف اور یہ دقیق بند — اور کتاب فطرت کی یہ حیرت انگیز تصویریں مادہ بے شعور کی پیدا کردہ ہیں؟ اور اس کائنات میں ایک عظیم

[1] انسان جب سانس لیتا ہے تو پھیپھڑے میں داخل ہونے والی ہوا کو آکسیجن اور خارج ہونے والی ہوا کو آزٹ کہتے ہیں۔
[2] وابستہ اوالی جہان علم۔

طاقت اور معجزانہ نظام کے خالق کا وجود نہیں ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ یہ تمام موجودات ایک قدرت کاملہ کی مخلوق ہیں جس کو ہم خدا کہتے ہیں!

مادہ کے باطن میں جو قوت ودیعت کی گئی ہے اگر یہ اس عقل کل کا اثر نہیں ہے جو اس کائنات کا حاکم ہے تو پھر کون سی چیز ہے جو مادہ کو اتنا منضبط اور منظم رکھے ہوئے ہے؟

اگر وہ طاقت ایک بے عقل عامل اور فاقد ارادۂ آگاہانہ ہے تو یہ مرحلہ بے نظمی میں کیوں نہیں داخل ہو جاتا؟ اور ان موارد کی تشکیل و ترکیب کو تصادم و نابودی کی طرف کیوں نہیں لے جاتا۔

یقیناً ایمان باللہ ان تمام موجودات کے لئے معنی عطا کرتا ہے اور تمام عالم کے لئے مفہوم و محتویٰ بخشتا ہے۔ صاحبان عقل اور فکر عمیق رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک عظیم قدرت مطلقہ ہے جو ان موجودات پر حاکم ہے اور اس نظام کو افراط و تفریط سے بچائے ہوئے ہے۔

موجود مطلق کا تصور

پہلے زمانہ میں ہر شخص بذات خود اپنے مرکوب کی ہدایت کرتا تھا اور اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا اور انسان ادوار مختلفہ میں اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ اپنی زراعت، زمین، ادارہ کی خود دیکھ بھال کرے ـــــ لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے آج کا انسان چاند تک پہونچ گیا ہے۔ آٹومیٹک الیکٹرک مشینیں، بغیر پائیلٹ کے اڑنے والے ہوائی جہاز اس کے دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ ایسے آلات بنائے جا سکتے ہیں جو حوادثات کا خود بخود مقابلہ کر سکیں اور اس کا بنانے والا اور چلانے والا چاہے سامنے نہ بھی ہو۔

جب یہ صورت حال ہے تو پھر ہم کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ ہم خالق کائنات کا صرف اس لئے انکار کر دیں کہ وہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تو ہمارے افکار و افہام کی کمی ہے اس سے وجود خدا تو متاثر نہیں ہوتا؟

اگرچہ ایک بہت ہی ناقص تشبیہ ہے مگر افہام مقصد کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مصنوعی چاند بنانے والا یا راکٹ بنانے والا زمینی اسٹیشنوں سے ان کو فضا میں چلاتا ہے اور خود زمین سے کنٹرول کرتا ہے۔ دیکھنے والے راکٹ و چاند کو دیکھتے ہیں، کنٹرول کرنے والا دکھائی نہیں دیتا (بلا تشبیہ) اسی طرح خدا تعالیٰ کائنات کو چلاتا ہے۔ مگر ہم دیکھ نہیں سکتے: ہم جن ظواہر آیات بینات کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ چیزیں خالق عالم اور صانع انسان کی عظمت کے آثار ہیں تو کیا اس مشاہدہ کے باوجود ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مدبر کا انکار کر دیں کہ جو صاحب قدرت و ارادہ مطلق ہے اور جو اس کائنات کے تمام حرکات کو منظم کرنے والا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ایسے موجود کا پہچاننا جس کا سرچشمہ حس اور اقلیم شعور میں کوئی

نمونہ و مثال نہ ہو اور بشری تعبیرات اس کے وصف دقیق کو بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ ہمارے لئے ناممکن ہے کیونکہ ہمارے امکانات محدود ہیں اور چراغ عقل اس راستہ کو روشن کرنے سے مبہوت ہے اسکی روشنی مادہ کے محدودیات کے دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

ہمارے ارتباطات صرف ظواہر حیات تک محدود ہیں جو صورت ہمارے ذہنوں میں مرتسم ہوتی ہے وہ اس کائنات کی کوئی نہ کوئی عینی ہے — لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی طرح بھی اس کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ جو معرفت ہمارے لئے لازم ہے اس میں اور ہمارے درمیان کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

کچھ شک پسند افراد جو اس فکر سلیم سے "جو فطرت سلیم سے پیدا ہوتی ہے" اعراض کرتے ہیں اور جو آثار طبیعت کے خوگر ہو چکے ہیں وہ ہر وقت خداوند عالم کی طرف سے اظہار معجزہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ معجزہ کے ذریعہ خدا پر ایمان لائیں اور اس کے وجود کے قائل ہو جائیں — مگر یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ خدا کی طرف سے جتنے بھی آثار ظاہر ہوتے ہیں وہ تھوڑی ہی مدت کے بعد عادی ہو جاتے ہیں اور فطری بن جاتے ہیں جنکی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دی جاتی۔ تمام ظواہر — اگرچہ وہ نظام طبیعت کے اجزاء ہیں — ابتدا میں خوارق و معجزات معلوم ہوتے ہیں لیکن جتنا جتنا دور گزرتا جاتا ہے وہ عادی اور طبیعی ہوتے جاتے ہیں۔

لیکن وہ وجود جو غیر محسوس اور غیر مرئی ہو اور جو صفات جلال و جمال قداست و عظمت سے مملو ہو وہ ہمیشہ نفوس کو تحت تاثیر قرار دیتا ہے اور اپنی طرف ہر اتمام و توجہ کو جذب کر لیتا ہے اور انسان کو ایسا بنا دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسکی طرف متوجہ رہے اور ہر چیز کی امید اس سے وابستہ رکھے

البتہ یہ جداوری کی روح کا تسلسل غیر منطقی بنیاد پر انسان کو محدودیت کی زنجیروں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ ورنہ اس نظام کائنات میں ہر موجود ان لوگوں کو قانع کر سکتا ہے جو اپنی عقلوں کو لجاجت اور مکابرہ سے خالی رکھیں۔

ڈاکٹر رائمر ڈبلیو میورا ELMER. H. MAURER جو بہت ہی مشہور اور علم کیمیا کے ماہر

تھے لکھتے ہیں: میں ایک عالم کیمیا ہونے کے ناطے اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ خدا کائنات کی ہمیشہ نگرانی اور حفاظت کرتا رہتا ہے اور قوانین فطرت کے دائمی ہونیکا سبب بھی الٰہی نگرانی ہے۔ میں جس وقت اپنی تجربہ گاہ میں قدم رکھتا ہوں۔ بغیر کسی شک و تردید کے اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ جو قوانین کل تک ثابت تھے وہ آج بھی ثابت ہیں۔ اور کل و پرسوں بلکہ قیامت تک ثابت رہیں گے ورنہ تجربہ گاہ کے اندر میری زندگی حیرت و تنگ قلق و اضطراب کی زندگی ہو جائے۔ اور ہم کسی بھی نتیجہ تک نہ پہونچ سکیں۔ مثلاً اگر میں اپنے تجربہ گاہ میں ایک برتن کے اندر پانی بھر کر آگ پر رکھ دوں تو جب اس میں جوش آجائے تو مجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی حرارت ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ پر پہونچ گئی ہے اور مجھے کسی حرارت ناپنے والے آلہ کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب فضا کا دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر بھی ظرجیوہ[1] پہونچ جائے تو آب خالص ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ میں پہونچ کر جوش کھانے لگتا ہے اور اگر دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر جیوہ سے کم ہو تو پانی کے جوش میں آنے اور بھاپ بن جانے کے لئے کم حرارت کی ضرورت ہوگی اور جوش کی جانے کے لئے درجہ حرارت ۱۰۰ درجہ سے کم ہوگا اور اگر فضا کا دباؤ ۷۶ سنٹی میٹر سے زیادہ ہوگا تو درجہ حرارت بھی سو سے زیادہ ہوگا۔

اور میں جب بھی چاہتا ہوں اس تجربہ کی تکرار کرتا ہوں اور علمائے کیمیا جب بھی دباؤ اور حرارت کے رابطہ کو اپنے روزانہ کے کاموں میں اپنی ذہانت اور ہوش سے استعمال کریں گے تو ان کی حیرت میں اضافہ ہی ہوگا۔

یہی صورت تمام قوانین طبیعت کی ہے اور صحیح منطق فیصلہ کرتی ہے کہ یہاں پر کوئی ایک مدبر ضرور موجود ہے جس نے ان قوانین کو ایجاد کیا ہے اور وہی خدا ہے۔ اس طبیعت کی خلقت اور اس کے ثابت و مستمر نظام کا صحیح جواب صرف خدا کے وجود کا عقیدہ ہے[2]۔

---

[1] جیوہ ایک مخصوص مائع ہے جو میزان الحرارت میں استعمال ہوتا ہے جو کہ دباؤ کے لحاظ سے اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے اس کو پارہ بھی کہتے ہیں۔ [2] اثبات وجود خدا ص ۲۲۹

خدا علّت سے بے نیاز ہے

خدا علت سے بے نیاز ہے اس مسئلہ میں پیروان مکتب مادی مخصوص حساسیت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جب ہم نے یہ مان لیا کہ کائنات میں واجب الوجود صرف اللہ ہے اور دیگر تمام موجودات اپنے وجود میں اس کی مدد چاہتے ہیں تو خود خدا علت سے کیوں بے نیاز ہے یعنی اس کے وجود کی علت کیا ہے؟

برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSEL) نے لندن میں ایک غیر مذہبی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: میں اپنی عمر کی اٹھارھویں منزل میں استوارت میل (STAVRT MILL) کی خود نوشت سوانح حیات پڑھ رہا تھا تو اس میں میل کے ایک جملہ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی اور وہ جملہ یہ تھا کہ میرے باپ نے میرے سوال "مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟" کا جواب نہیں دیا کیونکہ میں نے فوراً دوسرا سوال کر دیا تھا کہ پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ یہ کہتے ہوئے رسل نے کہا: اس سادہ سے جملہ میں آج بھی میں فکر کرتا ہوں اور میرا خیال ہے اس جملہ نے بیان اولین علت و دلیل میں مغالطہ سے کام لیا ہے کیونکہ جس طرح ہر چیز کے لئے علت و دلیل ضروری ہے پس وجود خدا کے لئے بھی علت ہونی چاہئے اور اگر کوئی چیز علت و دلیل کے بغیر وجود میں آ سکتی ہے تو وہ چیز خدا بھی ہو سکتی ہے اور دنیا بھی اور اس طرح یہ بحث فاقد الاعتبار ہو سکتی ہے۔[1]

افسوس یہ ہے کہ بہت سے خدا شناس مغربی فلسفی اس اشکال کو حل نہیں کر سکے۔ ہربرٹ اسپنسر (HEBERT SPENCER) انگریزی فلسفی اس سلسلہ میں کہتا ہے: مشکل یہ ہے

---

[1] مجلہ مسیحی نیستم ص ۸

کہ عقل بشر ایک طرف تو ہر چیز کی علت تلاش کرتی ہے اور دوسری طرف دور و تسلسل کو محال مانتی ہے اور علت بے علت کو بھی نہیں مانتی اور نہ سمجھتی ہے جیسا کہ پادری جب بچہ کو تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے: دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے اور بچہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟[1]

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں: دہریوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ دنیا بلا علت قائم بذاتہ ہے اور ازلی ہے، لیکن ہم کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کر سکتے جو بے آغاز اور بے علت ہو۔ اور خدا پرست اس سلسلہ میں ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے کہتا ہے: اللہ نے ہی دنیا کو پیدا کیا ہے اور جب بچہ سوال کرتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ لاجواب ہو جاتا ہے۔[2]

ہم بھی اعتراض مادہ پرستوں پر کرتے ہیں کہ اگر ہم سلسلہ علل کا تتبع کریں تو علت اولیٰ تک پہنچیں گے ہم یہ نہیں کہتے کہ علت اولیٰ خدا ہے بلکہ مادہ ہے اب تم بتاؤ مادہ اولیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ تم لوگ قانون علیت کو قبول کرتے ہو اس لئے مجھے بتاؤ کہ ہر چیز تو مادہ اولیٰ سے ہے مگر یہ مادہ اولیٰ کہاں سے آیا؟

تم کہتے ہو مبدء حوادث کی بازگشت مادہ اور طاقت اولیٰ کی طرف ہے: ہم آپ سے سوال کرتے ہیں: اس مادہ اور طاقت اولیٰ کے وجود کی علت کیا ہے؟ اور تسلسل علل و معالیل الی ما لا نہایۃ کو محال مانتے ہوئے ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کہیں: مادہ موجود ازلی ہے اس کو علت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کا اول ہے نہ آخر یہ مادہ قدیم ہے اس کی انتہا نہیں ہے اور اس کا وجود ذاتی ہے۔

پس مادی حضرات اصل ازلیت کے قائل ہوں گے اور ان کا عقیدہ ہوگا کہ تمام چیزیں مادۂ ازلیہ سے ہیں اور ہستی اس کی طبیعت سے ہوئی ہے، اس کو کسی موجد خالق کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] سیر حکمت در اروپا ص ۱۶۲

[2] تاریخ فلسفہ دین [illegible] ص ۲۹۶ ج ۲

رسل (RUSSEL) نے اپنی تقریر — جس کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہوا ہے — میں کہا ہے: ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ دنیا کی ابتدا تھی یا اس کا اول تھا۔ ہر چیز کیلئے ابتدا کا ہونا ضروری ہے اس موضوع پر غور و فکر کرنا درحقیقت ہمارے تصورات کی قدرت میں نقص دیکھی ہے۔

جس طرح رسل مادہ کو ازلی مانتے ہیں اسی طرح خدا پرست اللہ کو ازلی مانتے ہیں پس وجود ازلیت کا قول فلاسفہ مادی و الٰہی کے درمیان نقطہ مشترک ہے اور دونوں گروہ یکساں طور سے علت اولیٰ کو قبول کرتے ہیں بس فرق اتنا ہے کہ خدا پرست علت اولیٰ کو حکیم مدبر، قادر اور مرید مانتے ہیں (یعنی) خدا، اور مادی حضرات علت اولیٰ کو بے عقل و بے ادراک و بے ارادہ مانتے ہیں لہٰذا اگر خدا کو نہ بھی مانا جائے تب بھی اسکا سوال باقی رہتا ہے۔

مادہ محل حرکت و تغیر ہے۔ اسکی حرکت اندرونی ذاتی اور ڈینامیکی ہے اور ازلی چیز حرکت ذاتی کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی۔ مادہ اور ثبوت ذاتی دو الگ الگ چیزیں ہیں ایک جگہ پر ان کا جمع ہونا محال ہے جو چیز ذاتی طور سے ثابت الوجود ہے اس کی ہویت و ذات کا محل قبول حرکت ہونا ناممکن ہے۔

مارکسی (MARXIST) خود معترف ہیں کہ مادہ خود اپنی نفی کرتا ہے (آنتی تز) پھر اسکو یہ لوگ کیونکر ازلی مانتے ہیں؟ ازلیت کا مطلب ثبوت ذاتی اور امتناع انفنا ہے حالانکہ مادہ بذات خود نسبی استعدادات اور قوتوں کا مالک ہے اور مردہ و زندہ ہوتا ہے۔ ازلیت کسی بھی طرح مادہ کے مناسب نہیں ہے نہ اس کے وجود میں اور نہ لوازم ماہیت میں۔ لیکن خدا پرست

۱؎ جہان بینی نیستم ص۲

۲؎ مادی حضرات کی تفسیر کی بنا پر تمام چیزیں اسی ہستی کی تفسیر تز۔ آنتی تز۔ سنتز کی بنیاد پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں معلول بطن علت سے وجود میں آتا ہے اور معلول اپنی علت کی نقیض ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال مرغی کے انڈے اور اس کے بچے سے دیتے ہیں۔

جب اصل ثابت مطلق کے وجود کے قائل ہیں تو ان کا یہ دعویٰ اس وجود کے لئے ہے جو ثبات مطلق کو قبول کرتا ہے اور خصائص مادہ سے بالکل بعید ہے۔ ان کا دعویٰ مادہ کے لئے نہیں ہے جو کبھی وجود سے بقا کو قبول نہیں کرتا اور نہ ازلیت و دوام ہی قبول کرتا ہے۔ اور جو نسبیت و حرکت سے جدا نہیں ہوتا اور فعلیت تام و اطلاق سے مغایرت رکھتا ہے۔

ہر موجود محتاج علّت ہے۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ کسی موجود کا وجود علت کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا مطلب وہ موجود ناقص ہے جس کی میسر و تمام پہلو علت ہے۔ یہ قاعدہ ہر موجود کے لئے نہیں ہے یعنی اگر کوئی موجود نقص و محدودیت سے پاک ہو اور بذات خود واجد واقعیت ہو تو اس کے لئے یہ قاعدہ نہیں ہے۔

علت اولیٰ صرف اس لئے علت اولیٰ ہے کہ اس کا وجود کامل و غیر محدود ہے اور کسی عامل سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ ایک غیر مشروط وجود ہے اور ہر قسم کے علاقہ و رابطے سے مستغنی ہے تغیر و تحول کا اس میں کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔

خدا کے علت اولیٰ اور علت سے بے نیاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ محتاج الی العلۃ ہونے میں تو تمام موجودات کا مساوی ہے لیکن اس قانون سے بطور استثناء و تخصیص اس کو الگ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ معلول ہی نہیں ہے تاکہ کسی علت کا محتاج ہو۔ اور نہ وہ حادث ہے جو کسی محدث کا محتاج ہو بلکہ تمام صور و ظواہر و حوادث اسی موجد ازلی سے موجود ہوئے ہیں۔ قانون علیت صرف ان موجودات کے لئے ہے جو مسبوق بالعدم ہوں۔

اسی طرح علت اولیٰ کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس نے اپنے کو پیدا کیا ہے اور وہ خود ہی اپنی ذات کی علت ہے۔ ہمیشہ معلول کے محتاج الی العلۃ ہونے کا سبب اس کے نوع وجود و کیفیت کے تابع ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی موجود اپنے وجود کے لئے علت کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ علت کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا وجود دوسرے سے متعلق و مرتبط ہوتا ہے ورنہ موجود غیر مشروط دوسرے غیر مرتبط قانون علیت کے دائرے سے باہر ہوا کرتا ہے۔

اس توضیح کے بعد اب اگر کوئی موجود اپنے کمال اور غنائے ذاتی کی بنا پر علت سے بے نیاز ہو تو علت نے اسکو اس مرتبہ میں ہرگز قرار نہیں دیا جس میں وہ ہے اور نہ ہی کوئی علت اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔ علت اولیٰ کا وجود عین ذات ہے۔ بخلاف دوسرے موجودات کے ان کا وجود بطور اضافہ و عاریت ہے۔ خروج من العدم الی الوجود ہی علت کا محتاج بناتا ہے۔

اور یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ "تناقض میں پھنس جاتا ہے اور اگر ایسا ہے تو کیا کسی معلول کے بے علت ہونے کا عقیدہ (جیسے مادہ) "تناقض میں پھنس جاتا نہیں ہے؟

ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں کی ہر شئی معرض تغیر و تحول و فنا میں ہے اور فنا و محدودیت اس عالم کے تمام اجزاء کا مقدر بن چکی ہے۔ فقر و استناد الی الغیر ہمارے نفوس کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام موجودات میں بھی فقر و نیاز کا دور دورہ ہے اور یہ احتیاج ہمارے سراپائے ہستی پر محیط ہے کیونکہ ہمارا وجود ازلی نہیں ہے اور ہمارا وجود ہماری ذات سے نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم نہ تھے پھر ہم کو لباس وجود پہنایا گیا تو ہو گئے۔ اور بدون شک ایسے موجودات کی پیدائش ذات ہستی بخش سے ربط پیدا کئے بغیر غیر ممکن ہے۔

البتہ ازلی و ابدی واجب الوجود جس کا وجود ذاتی ہے جس کا نہ اول ہے نہ آخر اس کیلئے علت کی ضرورت نہیں ہے۔

فلسفہ میں علت کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی شئی کو عدم سے وجود میں لائے اور لباس ہستی پہنائے اور مادی علتوں میں اس کی قدرت نہیں ہوتی اور مادہ کا کام صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت کے ختم ہونے کے بعد نئی صورت کے قبولیت پر آمادہ ہو ــــ یہ درست ہے کہ موجود مادی اپنی ذاتی تحول و تغیر کی بنا پر ہر لحظہ ہویت جدیدہ پاتا ہے جو سابقہ سے مختلف ہوتی ہے لیکن یہ ذاتی حرکت اور مسلسل حدوث و فنا ہمیشہ دست حرکت آفریں کا محتاج بنا رکھتا ہے۔ ایسا دست حرکت آفریں جو کاروان شتابندہ کائنات کو جڑوں سے اگاتا ہے اور قافلۂ وجود کو آگے بڑھاتا ہے۔

سلسلہ علل کا تتبع

اگر مادی حضرات حقیقت کا انکار کریں اور ایک دوسرے مغالطہ کا سہارا لیکر کہنے لگیں کہ ہم سلسلہ علل کو کسی جگہ پر روک سکتے ہی نہیں اور لا متناہی حد تک اس کا سلسلہ باقی رکھتے ہیں تو اس مغالطہ کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ جہان آفرینش کا اس طرح تحلیل و تجزیہ کرنا ہی علت و معلول کے تسلسل کو قبول کرنا ہے کیونکہ ہر ایک کا ذاتاً معلول ہونے کا مطلب فاقد الوجود ہونا ہے اور علت مافوق کے بغیر ان میں سے کوئی بھی دارائے وجود نہیں ہے — لہٰذا اس سلسلہ کے اجزاء فرداً فرداً محتاج و فقیر ہوں گے تو وہ (بغیر علت) عدم سے وجود کی طرف کیونکر آئیں گے اور خود ان اشیاء کا وجود جو مظاہر حدوث و عجز ہیں کہاں سے ہوا؟ اور غیر متناہی اعدام کے اجتماع سے اتنے بڑے موجودات کا مجموعہ کیونکر حاصل ہوا؟ کیا بے شمار عوامل مرگ کے اجتماع سے زندگی پیدا ہوا کرتی ہے؟

حالانکہ یہ لا متناہی سلسلہ چاہے جتنا آگے بڑھ جائے یہ معلول ہونے ہی کے حکم میں رہے گا تو پھر قہری طور پر ہمیشہ محتاج و فقیر و حادث رہے گا۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ کوئی بھی سلسلہ جب تک ذاتی طور پر مستقل و غنی نہ ہو یا غنی بالذات المطلق — یعنی وجود الٰہی — تک منتہی نہ ہو وہ کبھی موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ (صرف وجود الٰہی ہی ایک ایسی علت ہے جو بغیر معلول کے ہے بشرطیکہ یہ تعبیر صحیح ہو) اور نظام موجودات کی کبھی بھی صحیح تفسیر ممکن نہیں ہے جب تک ایک ایسے موجود کو نہ مانا جائے جو غیر مشروط ہو اور وہی علۃ العلل ہو اور تمام موجودات کے وجود کی بنیاد۔

فرض کیجئے محاذ جنگ پر فوجیوں کی ہر ٹکڑی حملہ کرنے سے انکار کر دے اس طرح کہ

جب جنرل کسی ٹکڑی کو حملہ کرنیکا حکم دے تو وہ کہے جب تک فلاں ٹکڑی حملہ نہ کرے گی ہم حملہ نہیں کریں گے اور جب جنرل اس ٹکڑی سے کہے تو وہ اسی پر مثال دے کہ جب تک یہ حملہ نہ کرے گی ہم بھی نہ کریں گے یہی حال سب کا ہو تو کیا حملہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کی شرط لگا رکھی ہے اور ظاہری بات ہے کہ مشروط حملہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک شرط پوری نہ ہو جائے اور شرط پوری ہو نہیں سکتی لہٰذا حملہ بھی نہیں ہو سکتا۔

بالکل اسی طرح اگر سلسلہ علت و معلول کو غیر متناہی مان لیا جائے تو چونکہ ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر موقوف ہے اور وہ دوسرا بھی اپنی جگہ تیسرے پر مشروط و موقوف ہے و علیٰ ہٰذا تو درحقیقت ہر ایک اپنی جگہ سے یہ صدا بلند کر رہا ہے کہ جب تک وہ دوسرا موجود نہ ہوگا میں بھی لباس ہستی نہ پہنوں گا۔ پس یہ سب کے سب مشروط ہیں اور شرط کا تحقق ہو نہیں سکتا لہٰذا ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہو سکتا۔

لیکن جب ہم کائنات کو موجودات سے بھری دیکھتے ہیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی علت ضرور ہے جو دوسرے کی معلول نہیں ہے یا ایک ایسی شرط ہے جو مشروط نہیں ہے۔

اور وہ علت اولیٰ تمام صور موجودات سے غنی بالذات ہے۔ عجیب و غریب حوادث پر قادر ہے۔ خلاق و فاطر ہے جب چاہا پیدا کیا اور وہی ذات تمام اجزائے حیات کو وجود بخشتی ہے اور اپنے مقصد کے لئے عظیم نظام خلقت کو باقی رکھے ہے

مادی مذہب کے پیروکار یہ چاہتے ہیں کہ عالم کو قدیم مان کر اس کلیہ سے دست بردار ہو جائیں کہ کائنات ایک خالق کی محتاج ہے۔ اور اس طرح وہ کائنات کو مفہوم مستقل بنا دیں۔ حالانکہ کائنات کو قدیم مان کر بھی وہ اپنے حسب منشاء نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات اپنے ابتدائے وجود میں خالق کی محتاج ہے اور جب پیدا ہو گئی تو کسی خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ مخلوق ہونے کے بعد کائنات اور اللہ دو الگ الگ مفہوم مستقل ہوں گے ایک کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہوگا۔ اسی لئے ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ کائنات کے احتیاج اول کو ختم

کر دیا جائے اور اس طرح وہ اپنے زعم ناقص میں خلقت و خالق کے مسئلہ کا حل ڈھونڈھ نکالیں گے ۔ اور یہ ثابت کریں گے کہ عالم قدیم ہے وہ خدا کا محتاج نہیں ہے ۔

مگر ایسا نہیں ہے بلکہ پیدائش کے بعد سے کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ ہر وقت حادث ہے اور جب سارے اجزاء ہر لحظ حدوث سے متصف ہیں تو مجموعہ بھی حادث ہوگا کیونکہ مجموعہ اپنے اجزاء کے صفات سے الگ کوئی صفت نہیں رکھتا ۔ لہٰذا کائنات کے لئے ابتدائے خلقت میں جو احتیاج تھا وہ موجود و مستمر ہے آج تک بھی اور ہر زمانہ میں بھی ۔ اور عالم کو قدیم مان کر اس کو خدا سے الگ کر کے مستقل ماننا ناممکن ہے ۔

عالم حادث ہے۔

جس طرح انسان امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی قوتوں میں کمی محسوس کرتا ہے اور ایک دن اس کے عمر کا چراغ بجھ جاتا ہے اسی طرح سے عالم بھی رفتہ رفتہ فنا کے گھاٹ اتر جائیگا۔

چونکہ کائنات فانی ہے لہٰذا مادہ کو جوہر ازلی فرض کرنا غیر ممکن ہے بلکہ کائنات کو بھی مخلوق اور حادث ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ کائنات میں موجودہ طاقتیں وحدت نوعیت کی طرف گامزن ہیں۔ ذرات طاقتوں میں بدل رہے ہیں اور فعال طاقتیں ساکن و غیر فعال طاقتوں کی طرف بدل رہی ہیں اور جب طاقتیں ایسی طاقتوں کی طرف بدل جائیں گی جو واحد فی النوع کے مساوی ہیں تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ سکون اور سکون مطلق میں ڈوب جائیں۔ اسی لئے مادہ کو بعنوان ذات یا جوہر ازلی قبول نہیں کیا جا سکتا بلکہ مجبوراً کائنات کو مخلوق ماننا ہوگا۔

اصول تھرموڈائنامیکس (PRINCIPLES OF THERMODYNAMICS) کی دوسری اصل جس کو "فرسائش دکھنگی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ چاہے ہم کائنات کی تاریخ پیدائش کو معین نہ کر سکیں مگر اس کائنات کی یقینی طور پر ایک ابتداء ہے کیونکہ کائنات کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے جس طرح لوہے کا ٹکڑا جو آگ میں رکھنے کی وجہ سے سرخ ہوگیا ہو باہر نکالنے پر رفتہ رفتہ اس کی حرارت کم ہوتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی حرارت فضا کی حرارت کے برابر ہو جاتی ہے۔

اگر کائنات کا کوئی نقطہ آغاز نہ ہوتا تو تمام وہ موجودہ ذرات جو ازل سے چلے آ رہے ہیں، بہت مدت پہلے ایٹم کی صورت میں مبدل ہو چکے ہوتے اور کائنات کی حرارت نہ معلوم کب ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ مادہ برابر غیر مرئی ایٹم کی طرف بدلتا رہتا ہے جو مسلسل تحول و تبدل

کی منزل طے کرکے ایٹم بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ مادہ اور اجرام متناسبہ کی صورت میں کبھی نہیں پلٹتا

اصل دوم کے مطابق قابل استفادہ طاقت کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ کیمیائی فعل و انفعال کا تحقق نہیں ہوا کرتا۔ اور جب یہ معلوم ہے کہ کیمیائی فعل و انفعال دائمی ہے اور اس کرہ ارض پر زندگی مستمر ہے اور سورج کی وہ شعاعیں جو روزانہ تین لاکھ ڈگری ذاتی حرارت پیمائش کے حساب سے خارج کرتی ہیں وہ بھی مستمر ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات حادث ہے۔

سیارات و ستاروں کی موت سورج و کواکب کا نابود ہو جانا حدوث کی دلیل ہے اسی طرح موت و حیات موجودہ نظام کے حدوث کی دلیل ہے اور اس پر بھی دلیل ہے کہ عالم فنا اور انتہا کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں علوم طبیعی مادہ کو قدامت سے خارج کرکے نہ صرف حدوث عالم کو ثابت کرتے ہیں بلکہ اسکی بھی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات ایک معین وقت میں پیدا ہوئی ہے۔

پس یہ کائنات آغاز ولادت میں ایک ماورائے طبیعت طاقت و قدرت کی محتاج تھی کیونکہ آغاز میں ساری چیزیں برابر تھیں ان میں کوئی تفاوت نہیں تھا تو کائنات کو حیات بخشنے میں کوئی خارجی طاقت ضرور تھی ورنہ ایک محیط جس میں کوئی فعال طاقت نہیں تھی جس پر سکوت بلکہ سکوت مطلق چھایا ہوا تھا وہ کیونکر جنبش و حرکت میں آیا؟ ماننا پڑے گا کوئی خارجی طاقت تھی جس نے اسکو حرکت بخشی!

پروفیسر نعمایہ تحریر کرتے ہیں: آج کا مادہ پرست انسان دعویٰ کرتا ہے کہ ایک بہت بڑے انفجار اور طوفان کی وجہ سے کائنات کی آفرینش ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے انفجار کا ایندھن اور فضائے مطلق موجود تھی جس میں یہ عجیب حادثہ رونما ہوا ہے! دوسرے لفظوں میں پھر یہ ماننا ضروری ہو جائیگا کہ مادہ ازلی اور کائنات کے تمام موجودات مثلاً نور، گردوں، ستارے، کہکشاں یہ سب پہلے سے موجود تھے اور یہ ایک حقیقت ہے جو علمی

فکری، روحی، ریاضی کے حساب سے ناقابل انکار ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ فضا میں منتشر اجزا اس انفجار کے نتیجہ میں کیونکر ایک جرم معین میں داخل ہو گئے؟ اور یہ جرم عظیم آیا کہاں سے؟ اور بعض بعض کے اوپر کیونکر ڈھیر ہو گئے؟

اسی لئے، جو لوگ کائنات کی اچھی طرح معرفت رکھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: ہماری کائنات میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور ہر چیز تغیر و تحول کی حالت میں ہے۔

نیز روح کی طرف توجہ کئے بغیر مادہ کی تعریف غیر ممکن ہے۔ روئے زمین پر زندگی کی چھوٹی سی حرکت بھی ایک قادر اور عالی حکمت والے کی مقدر کردہ ہے جس کو بطور اتفاق کہا ہی نہیں جا سکتا۔

مگر ان دقیق تقدیرات کی معقول و مقبول تفسیر بقول آئنسٹائن (EINSTEIN) بغیر وجود خدا مانے ہوئے ممکن نہیں ہے۔[1]

میکینکس (MECHANICS) کہتا ہے: جو جسم ساکن ہے وہ ہمیشہ ساکن ہی رہے گا اگر اس میں حرکت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسی خارجی طاقت کے ذریعہ ہوگی جو اس جسم سے الگ ہو۔ ہمارے عالم مادہ میں یہ اصلی اور معتبر قانون ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی طرح صدفہ و اتفاق کے احتمال کو قبول نہیں کرتے۔ اسی میکانکی قاعدہ کی بنیاد پر ایک ایسی قوت کا ماننا ضروری ہے، جو خود تو مادہ نہ ہو۔ لیکن مادہ کو خلق کرے اور اس کو قوت و حرکت بخشے تاکہ مختلف شکل و صورت کا وجود ہو۔ فرینک لین (FRANKLIN) — علم فزیا کے بہت بڑے مشہور عالم — نے خدا کے وجود پر ایک خوبصورت استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: بہت سے لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ جہانِ مادی کسی پیدا کرنے والے کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن جو بات ناقابل تردید ہے وہ یہ کہ کائنات بہرحال موجود ہے۔

---

[1] دو ہزار دانشمند در جستجوئے خدای بزرگ ص۱۵

اب اس کائنات کے وجود میں آنے کی چار صورتیں ممکن ہیں :-

۱۔ کائنات کو صرف ایک خواب و خیال مانا جائے ۔
۲۔ کائنات بغیر کسی خالق کے خود بخود موجود ہو گئی ۔
۳۔ کائنات قدیم ہے ، ازلی ہے اسکی کوئی ابتدا نہیں ہے ۔
۴۔ کائنات مخلوق ہے حادث ہے ایجاد کردہ ہے ۔

پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ دراصل کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ سوائے مسئلہ میٹافزیکی ضمیر — مسئلہ حیات بعد الموت — اور خود آگاہی آدمی مگر وہ خود بھی اس صورت میں خواب و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔ اس پہلی صورت کی بنا پر ہمارے لئے یہ فرض کرنا ممکن ہے کہ بہت سی خالی ریلیں وہمی مسافروں سے بھری ہوئی مفہوم ذہنی سے بنے ہوئے غیر مادی پلوں سے — جو غیر واقعی نہروں پر بنے ہیں — گذر رہی ہیں ۔

دوسری صورت بھی پہلی صورت کی طرح بے معنی اور محال ہے اور کسی بھی اعتبار سے قابل توجہ نہیں ہے ۔

اب رہی تیسری صورت تو وہ تصور آفرینش کے ساتھ ایک جزو مشترک رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مادۂ بے جان " جو طاقت میں ملا ہوا ہو " یا شخص خالق دونوں ازل سے موجود ہیں اور ان دونوں تصوروں میں کسی میں دوسرے سے زیادہ اشکال نہیں ہے دونوں برابر ہیں ۔ مگر قانون تھرموڈائنامکس (THERMODYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات مسلسل ایک ایسی حالت کی طرف رواں ہے کہ جس میں تمام اجسام درجہ حرارت میں مشابہ ہیں اور پھر اس کے بعد طاقت کسی مصرف کے قابل نہیں رہتی ایسی صورت میں اس کرہ پر زندگی محال ہو جائیگی ۔

اگر کائنات کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور یہ ازلی ہے تو اس پر اس سے پہلے موت وارد ہو جانا چاہئے تھا ۔ چمکنے والا سورج ، روشن ستارے ، زندگی سے بھرپور زمین اس بات کے بہترین گواہ ہیں کہ کائنات کے لئے زمانی آغاز ہے جو عدم کے بعد ہوا ہے ۔ اور اس کا آغاز

زمانہ کے ایک خاص لمحہ میں ہوا ہے۔ لہذا عالم بہرحال مخلوق ہوگا اور اس کے لئے ایک علت کبریٰ یا خالق ابدی عالم و قادر ماننا ہوگا جس نے اس عالم کو پیدا کیا ہے[۱]۔

---

[۱] اثبات وجود صفحہ ۱۵

انسان کی بے بسی اور محدودیت

اگر انسان تھوڑی سی گہرائی میں جا کر سوچے اور واقعیات پر زیادہ وسیع النظری سے غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ جغرافیائے ہستی کی وسعت کے مقابلہ میں ہماری توانائی نہ ہونے کے برابر ہے مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد نظام کائنات کے بارے میں انسانی معلومات صفر کے برابر ہیں کیونکہ علوم نے اگرچہ کافی ترقی کر لی ہے۔ لیکن ہمارے مجہولات اتنے زیادہ ہیں کہ ہمارے معلومات کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی۔ شاید ہزاروں بلکہ لاکھوں انواع بشر اس دنیا میں آ کر چلے گئے اور مستقبل میں نہ معلوم کتنے آئیں گے لیکن ہم کو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

آج کے علماء جن چیزوں کو علوم و معارف سمجھ رہے ہیں اور تمام واقعیات کے جاننے کا آئینہ خیال کر رہے ہیں وہ چند ان قوانین کا مجموعہ ہے جو کائنات کے کسی گوشہ سے متعلق ہے۔ اور ان تمام تلاش و جستجو و تجربہ کا حاصل صرف ایک چھوٹے سے روشن نقطہ کا جان لینا ہے اسکی مثال یوں سمجھئے ایک ایسے صحراء کے وسط میں جس کی انتہا معلوم نہ ہو شدید تاریک رات میں ایک چھوٹی سی شمع کی بہت ہلکی روشنی ہو اس سے جتنی دور کا علم ہو سکتا ہے اسی طرح اس کائنات میں انسانی معلومات کی حیثیت ہے۔

اگر ہم کھربوں سال تک پیچھے چلے جائیں تو ہم کے غبار اس فضا کو چھپا لیں گے کائنات کی عظمت کے سامنے اس سے بشر کی کمزوری کا اندازہ لگائیں۔ اور شاید یہ مدت عمر کائنات کے مقابل میں ایک لمحہ سے زیادہ نہ ہو۔ اس حال میں ہم انسانیت کے محیط عدم میں داخل ہوں تو اس عدم کے تاریک دریا میں انسان کی کوئی خیر و خبر بھی نہیں ملے گی۔

مختصر یہ ہے کہ ہم نہ اپنے آغاز کے بارے میں صحیح خبر رکھتے ہیں اور نہ آئندہ کی حالت سے

واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم تصدیق کر سکیں کہ زندگی صرف اسی کرۂ خاکی ہی میں منحصر ہے کیونکہ آج کے علماء منطقہ حیات کو بہت زیادہ وسیع خیال کرتے ہیں۔ اور کروڑوں بے شمار کرات" جن کو ہم عظیم ترین دوربینوں ہی سے دیکھ سکتے ہیں" چیونٹی کے برابر دکھائی دیتے ہیں۔

کامیل فلاماریون (CAMMILLE FLAMMARION) مشہور عالم اپنی کتاب "الھیئۃ الفضائیہ" میں عالم لامتناہی کی طرف ایک خیالی و فرضی سفر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم اسی تیز رفتاری کے ساتھ — وسیلۂ نقل کی رفتار میں کمی کے بغیر — ایک ہزار سال، گیارہ ہزار سال، ایک لاکھ سال۔ تین لاکھ کومیٹری سکنڈ کے حساب سے دس لاکھ سال سفر کرتے رہیں تو کیا اس عالم محسوس کے کنارے تک پہونچ جائیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہاں تو ایک عظیم تاریک فضا ہے جس کا عبور کرنا ضروری ہے نیز جدید ستارے ہیں جو دوسرے آسمان کی انتہا میں چمک رہے ہیں۔ اگر ہم ان کی طرف چلیں تو کیا پہونچ جائیں گے؟ ....

اس کے بعد چند صد ملیون سال سفر کریں تو پھر وہی تازہ اکتشافات، شکوہ و عظمت جدید، عالم تازہ، جدید عالم، نئی زمین، نئی چیزیں، نئے موجودات کا سامنا ہوگا۔ اس کے بعد کیا؟ ..... پھر وہی صورت حال افق بند نہیں ہوگا اور کوئی آسمان ہماری راہ روک سکنے والا بھی نہ ہوگا۔ ہمیشہ فضا، ہمیشہ فضا! ہم نے کونسا راستہ طے کیا ہے؟ ارے ابھی تو ہم اسی نقطہ پر ہیں۔ نقطۂ ابتدا میں! بس ہر جگہ مرکز موجودات ہے اور دائرہ موجودات کا کوئی محیط متوسط نہیں ہے۔

ہاں یہ عالم لامتناہی ہے جو ہمارے سامنے کھلا ہے لیکن ابھی تو اس کا مطالعہ بھی شروع نہیں کیا ہے۔ ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خوف سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اس بے مقصد مسافرت سے تھک کر گر پڑیں گے۔ کہاں گر پڑیں گے؟ ممکن ہے مدت ابدیت میں گر پڑیں، بے پایاں گرداب میں گر پڑیں بغیر اس کے کہ اس کی گہرائی تک پہونچیں جس طرح پہاڑ کی چوٹیوں پر نہیں پہونچ پاتے۔ شمال جنوب ہو جائیگا۔ آسمان کون سا ہے؟ نہ مشرق ہے نہ مغرب نہ اوپر نہ نیچے نہ دایاں

رہا ہیں۔ جس طرف بھی عالم کو دیکھتے ہیں ہر طرف سے غیر متناہی ہے۔ اس غیر متناہی مجموعہ کے اندر ہماری دنیا ایسی ہے جیسے جزیروں کے بہت بڑے مجموعہ میں کوئی جزیرہ اور یہ جزیرہ بھی ایسے سمندر میں ہو جس کی انتہا نہ ہو۔ اور پوری کائنات بشریت کی عمر تمام سیاسی و دینی ادوار کے ساتھ بلکہ تمام عظمت کے ساتھ ہماری زمین کی عمر ایک لمحہ خواب سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر انسان کے تمام تحقیقی آثار جس کو لاکھوں اور دانشمندوں نے لاکھوں کتابوں کے اندر تحریر کیا ہے دوبارہ تحریر کیا جائے تو ایک پیالہ روشنائی اس کے لئے کافی ہو گی۔ لیکن اگر تمام کائنات کی موجودات خواہ وہ زمینی ہوں یا آسمانی ماضی میں رہے ہوں یا مستقبل میں موجود ہوں سب کو تحریر کیا جائے تو ممکن ہے روشنائی کے لئے دنیا کے سمندر کافی نہ ہوں۔[1]

پروفیسر بولایہ کہتے ہیں: اگر تم اس کائنات کا تصور کرنا چاہو تو تم یہ سمجھ لو کہ اس کائنات کے اندر اتنی کہکشائیں ہیں کہ اگر زمین کے تمام ساحلوں کی ریگ اکٹھا کر لو تب بھی کہکشاؤں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔[2]

---

[1] قرآن میں ہے اگر زمین کے تمام درخت قلم اور ایک دریا کی سات دریا مدد کریں کے روشنائی بن جائیں تو کلمات خدا تمام نہ ہوں گے (کہف ۱۰۹)

[2] دو ہزار دانشمند در جستجوئے خدائے بزرگ ص ۱۳

علمی دھوکہ بازی

مادی حضرات دعویٰ کرتے ہیں اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جو مادی مدرسے قائم کئے گئے ہیں، انھیں کے طفیل میں آج علمی ترقی ہو پائی ہے۔ اور ڈیالکٹیک تلاش حق منطق ذریعے سے وہ میوہ ہے جو علم کے پر بار درخت سے حاصل کیا گیا ہے۔

یہ لوگ فلسفۂ مادی کے علاوہ ہر فلسفہ کو دینی اور غیر علمی بتاتے ہیں اور اپنے مکتبِ مادی کو علمی مدرسہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حیات بعد الموت کے مسئلہ سے اعراض ہی حقیقت ہے، اسی طرح حسی و تجربی منطق اور مادی فلسفہ کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن یہ دعویٰ مبنی بر تعصب ہے اور ایسے نظریات پر قائم ہے جو بے بنیاد و بے دلیل ہیں اور اس قسم کی اصطلاحیں انھیں لوگوں کے افکار کا نتیجہ ہیں جن کا مرکز تفکر مادہ اور صرف مادہ ہے وہ کسی چیز کو مادہ کے بغیر دیکھتے ہی نہیں۔

یہ بات بحث سے بالا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ معارف بشری اور ثقافت کے عظیم منابع میں سے ایک منبع (چشمہ) ہے۔ اور خدا کی معرفت بعنوان یک جہاں بینی راستین نے مختلف ادوار میں اجتماعی اصول میں ایک تطور عمیق اور انسانی افکار میں ایک بنیادی تغیر ایجاد کیا ہے۔ اور آج بھی — جو علم و ٹکنالوجی کا دور ہے — جبکہ بشر نے فضا کی راہوں کو کھول دیا ہے۔ علماء کا ایک بہت بڑا طبقہ جو اپنے نظام فکر و عقیدہ میں مذہبی معرفت رکھتے ہیں وہ منطق و استدلال کی راہ سے وجود خدا اور مبدء ہستی تک پہونچ گئے ہیں۔

اگر مادہ پرستوں کی تفسیر صحیح اور واقعی ہوتی اور تاریخ فکر مادی کی معرفت فقر و ضعف سے ناشی نہ ہوتی تو علم اور مادیت کے درمیان ایک رابطہ خاص ہوتا اور محیط علمی میں تنہا مادی

عقاید اپنا وجود منوا لیتے ۔

کیا ہر دور میں تمام علماء و فلاسفہ الحادی نظریے کے تھے ! اور کیا سب کے سب مادہ پرست تھے ؟ بلکہ اگر مفکرین کے احوال و آثار کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ نہ صرف یہ کہ مذہبی لشکر واقعی مفکرین و محققین سے خالی نہیں تھا بلکہ بہت سے مفکرین و بزرگ علماء اور بہت سے علوم و دانش کے موسس مکتب توحید کے پرچمدار تھے !

مادی اور الحادی عقیدہ کا تعلق کبھی بھی درجۂ تکامل و پیشرفت علوم سے نہیں رہا ۔ بلکہ عہد اول اور طول تاریخ میں یہ مادہ پرست ہمیشہ اہل توحید کے صفوف کے سامنے اپنے کفر و الحاد کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں ۔

آج مارکسی عوام کے نزدیک علم سب سے زیادہ گمراہی کا ذریعہ بن گیا ہے اور تمام جماعتوں سے زیادہ یہی جماعت گمراہ ہے ۔ ان کے لئے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ فہم و دانش کی مدد سے صحیح راستہ تلاش کرتے اور تعصب و عصبیت اور جملہ بازی کو چھوڑ کر منطقی طریقہ سے تحقیق کر کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتے ۔ یہ لوگ ابتک جمود اور عقائدی تقلید میں مبتلا ہیں اور مغرورانہ طور پر تمام عقل و فکر کی بلند و بالا ارزشوں کا انکار کرتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پھر اپنے اس انکار پر فخر و مباہات بھی کرتے ہیں ۔

یہ لوگ کہتے ہیں : علم آنے کے بعد وجود خدا کا مسئلہ منسوخ ہوگیا ۔ یہ بات منطق سے بہت دور ہے یہ تو بس ایک قسم کی نعرہ بازی ہے ، کیونکہ ہزاروں علمی تجربوں کے بعد بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکا کہ کوئی موجود عاقل غیر مادی وجود نہیں رکھتا ۔ بلکہ مادی عقیدہ تو میٹا فزیکی عقیدہ ہے جس کی نفی یا جس کا اثبات صرف منطقی طریقوں ہی سے کیا جاسکتا ہے اس لئے اگر مادی عقیدہ قبول بھی کر لیا جائے تو اس سے میٹا فزیکی عقیدہ کی نفی نہیں ہوجاتی ۔ اسی لئے مدرسہ مادی کا تخیل نہائی میں اس طرح کی بات کرنا مکمل طور پر بے معنی بات ہے علاوہ اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے ، بلکہ یہ غلط عقیدہ صرف حقائق کی تحریف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے ۔ اور اس مادی مدرسہ کو علمی کہنا علم و حقیقت کے ساتھ خیانت کرنا ہے ۔

یہ بات درست ہے کہ انسان کل تک طبیعی علل و عوامل کو نہیں جانتا تھا۔ اور اس کے ارد گرد ہونے والے حوادث کے اسرار و رموز سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کا ایمان جہالت سے ناشی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے حقائقِ عالم کے انکشاف کے بعد معرفتِ خدا کی بنیاد ہی ڈھ جاتی اس کے برخلاف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسرارِ وجود جتنے زیادہ منکشف ہو رہے ہیں۔ عقیدہ بر خدا اور زیادہ واضح و روشن ہوتا جارہا ہے۔

علم اگرچہ صرف فضائے محدود کو روشن کرتا ہے۔ اور معرفت و علم جہان شناسی جزئی ہے کلی نہیں ہے کیونکہ علم کائنات کی صورت کاملہ کا ارائہ کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے باوجود شناختِ علمی دقیق اور مشخص ہے اور توانائی بخش ہے اس لئے علوم میں جتنی وسعت ہوتی جائیگی خدا کی معرفت اتنی ہی علمی اور منطقی ہوتی جائے گی۔ کیونکہ انسان کی آگاہی ازراہِ شناختِ اسباب وعلل ومعلول ہوگی اور جب ایسا ہوگا تو انسان اصلی عامل اور علت اولیٰ جو ان تمام عوامل وعلل کی اصل ہے، اس سے چشم پوشی نہیں کر سکے گا۔

بقول پروفیسر روایہ : انسانی علم پہلی مرتبہ اعلان کرتا ہے ــ اور یہ اعلان کسی ضعف و عاجزی کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق و تجربہ کی بنا پر ہے ــ کہ عرصہ وجود میں علم انسانی کا وظیفہ ذات باری اور اسکی تجلیات کی معرفت کے سوا کچھ اور نہیں ہے - اور واجب ہے کہ ان تمام کوششوں کو خدائے بزرگ کائنات کی ایمانِ علمی اور صحیح منطقی معرفت پر صرف کیا جائے ــ اور یہ بات بھی زیر بحث نہیں ہے کہ علم ایمان سے یا ایمان علم سے مصالحت کرے گا؟ کیونکہ تمام دینی کتابیں، سارے انبیاء اور تمام دینی مفکرین نے عقل کو بہترین و برترین موہبۂ انسانی بتایا ہے اور ان حضرات نے عقل سے مکمل استفادہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

اکثریت کی جہالت، بے سوادی اور جھوٹے تعصبات کی عمومیت اور بے فائدہ احساسات کے غلبہ نے قرون اس دعوت کو پیچھے ڈالے رکھا۔ اور اب جبکہ انسان عصرِ عقل و دانش میں داخل ہو چکا ہے۔ اور اسکے تمام وسائل و امکانات کو اپنی زندگی میں روز بروز وسعت دے رہا ہے تو اب ضروری ہے کہ عقول و افکار کی تربیت پر

خاص توجہ دی جائے اور اس علم کی طرف توجہ کی جائے جو صحیح طریقہ سے مورد استفادہ ہو۔

مثلاً اس جہان یا اس جہاں اور اس کہکشاں یا اس کہکشاں کا نہیں ہے اور نہ کھربوں نوری سال کا مسئلہ ہے اور نہ عظمت کائنات کا مسئلہ ہے بلکہ دراصل مسئلہ اس دانش کا ہے کہ جو صحیح طریقے سے مورد استفادہ واقع ہو۔[1]

کل تک انسان تنہا اپنے پیکر متناسب و موزون کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور اس کا مشاہدہ کرتا تھا۔ لیکن وہ پیچیدہ اسرار جو اسکی آفرینش میں ودیعت کئے گئے تھے ان سے ناآشنا تھا۔ مگر آج اپنے اس چھوٹے سے جسم کی وسیع و حیرت انگیز معلومات رکھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے بدن میں دس ملیون ملیارد[2] خلایا استعمال کئے گئے ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ ایسے مصنوع کے بنانے والے کی عظمت کا اندازہ موجودہ تمام علمی ذرائع و وسائل کے باوجود نہیں لگایا جا سکتا۔

اب سوچئے کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ خدا پر صرف انہیں لوگوں کا عقیدہ ہے جو انسان کی کیفیت آفرینش سے آگاہ نہیں ہیں؟ اور کیا وہ عقلمند جو عمل و عوامل طبیعت سے باخبر ہے اور سیر تکامل و رشد انسان سے مطلع ہے۔ اور جو جانتا ہے کہ تمام مراحل وجود میں قانون و دقیق حساب کی حکومت ہے وہ اس بات کا معتقد ہو جائیگا کہ حیرت انگیز قوانین کا بنانے والا ایک بے ادراک و بے شعور مادہ ہے؟ کیا یہ تمام انکشافات اصولاً اس دانشمند کو اس منزل پر پہونچائیں گے کہ وہ تمام موجودات کے خالق اور خود اپنے پیدا کرنے والے کو بے شعور مادہ کی طرف نسبت دے؟ مادی ثقافت جو کائنات کو آنکھ بند کر کے دیکھتی ہے وہ ہمارے لئے بہت سے ایسے سوالات چھوڑ دیتی ہے جن کا جواب

---

[1] دوہزار دانشمند در جستجوئے خدا نشر زندگی ص ۲۱

[2] ایک ہزار ملیون کا ایک ملیارد ہوتا ہے۔

ہی نہیں ہے!

دانشمندانِ الٰہی نے از نظرِ متافزیکی یہ بات ثابت کی ہے کہ وجود کا دائرہ مادہ سے کہیں زیادہ وسیع تر و گسترده تر ہے اور غیر مادی موجودات کی دنیا مادیات کی دنیا سے بہت بالا و غنی اور پر دامن ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نظامِ طبیعت کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وجود کی ایک ایسی صورت کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں جو مادہ سے مجرد مبرّا ہے اور اس کی ذات کی شناخت علومِ تجربی کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ ظواہر و حوادثِ طبیعت اس کی حقیقتِ ذات کی حکایت کرتی ہیں۔ کیا یہ توحیدی فکر اس بات کی دلیل ہے کہ مدرسۂ توحید جنبۂ علمی سے خالی ہے؟

علم کے پاس از قبیل کیا دنیا دو حصوں میں منقسم ہے مادی و معنوی؟ دنیا کے لئے کوئی ہدف و مقصد ہے کہ نہیں؟ سوالات کے جوابات نہیں ہیں! کیونکہ اصطلاحی طور پر یہ سوالات علمی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ معرفتِ علمی ہم کو بعض موجودات کی خبر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو زندگی کے بارے میں صحیح آگاہی نہیں دے سکتی اور نہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ہم کو وہ راہ و روش بطور الہام بتلا دے جس کو ہم اپنی زندگی میں اختیار کریں۔

برٹرانڈ رسل (BRTRAND RUSSEL) کہتا ہے: اگر آج کا علمی تمدن مفید ثابت ہوتا تو علم کی زیادتی اور پیشرفت سے عقلِ انسانی میں اضافہ ہوتا — عقل سے میری مراد مقصد حیات کا ادراک ہے — مگر جدید تمدن یہ فائدہ نہیں پہونچا رہا ہے لہٰذا انسان کی ترقی کیلئے علوم کی زیادتی و ترقی چاہے جتنی ضروری ہو مگر یہ علوم انسان کی صحیح ترقی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔

لہٰذا علمی معرفت میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ انسانی آئیڈیالوجی کا مدرک بن سکے کیونکہ علمی معرفت کی عملی آئینہ یالوجی سے زیادہ علمی قیمت ہے۔ اور یہ انسان کو طبیعت پر مسلط کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ چیز جو اس کو ایمان و عقیدہ کے مدرک پر متمکن کر سکتی ہے وہ وا قعی و نظری قیمت ہے نہ صرف علمی!

۱۔ جہان بینی علمی

تمام علوم کا دار و مدار تحقیق و تجربہ و ملاحظہ پر ہے اور تجربہ پر مشتمل قوانین متزلزل و غیر ثابت ہوتے ہیں اور ایمان کے لئے ایک ایسا مدرک چاہئے جو دائمی و ہمیشگی سے ہمکنار ہو۔ تزلزل و تغیر سے بہت دور ہو اور اس میں یہ بھی صلاحیت ہونی چاہئے کہ جہاں شناسی کے مخصوص مسائل جو تمام کائنات کے شکل و ماہیت سے مربوط ہوں ان کا معتمد و جاودانہ جواب دے سکے۔ اور وجود کے تفسیر عالم کی انسانی ضرورت کو پورا کر سکے۔

انسان کامل اعتدال فکری و روحی کا محتاج ہے اگر اس کا کوئی ہدف معین نہیں ہے تو وہ ضائع و ہلاک ہو جائے گا۔ اگر دین و مذہب کی طرف سے اسکو کوئی معین ہدف نہ مل سکا تو وہ خود ساختہ ہدف کو اپنا لے گا اور یہ نظام طبیعت کے خلاف ہوگا اور جمود فکر کا سبب بنے گا۔

دور حاضر کے انسانی علمی انکشافات نے انسان کو دنیا کے عمومی قوانین و نظام کا معتقد بنا دیا ہے اور اس عقیدہ میں یہ افراط ہو گیا ہے کہ انسان عنصر مادی کی اصالت و حاکمیت کا قائل ہو گیا۔ اور اسکو ازلی مان بیٹھا اور عملی طور سے تاریخ یا طبیعت کی الوہیت و قاہریت کا معتقد بن گیا۔ اور انسان کی محض شخصیت و اختیار کا انکار کر کے ڈیالیکٹکی جبر کے سامنے انسان کو دست بستہ اور مجبور سمجھنے کا قائل ہو گیا۔

اور اب علوم کے تدریجی تقدم کے ساتھ معرفت اور عالم کے بارے میں علمی نظریہ وحدت توحیدی کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اور وہ حوادث و ظواہر جو پہلے غیر مرتبط معلوم ہوتے تھے اب ایک رابطے سے مرتبط معلوم ہونے لگے ہیں۔ اور ایک منشاء کی طرف ان کی بازگشت تسلیم کی جانے لگی ہے۔ مختصر یہ کہ ظواہر مختلفہ و متناثرہ میں ایک علاقہ و بستگی کا عقیدہ پیدا ہو گیا ہے اور جب یہ دیکھا جائے گا کہ فاعلیت تو ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہے تو پھر تمام ظواہر کو اسی ایک مرجع کی طرف اور اسی ایک مبدأ کی طرف پلٹایا جائیگا۔ اور پھر تمام ظواہر مجتمع ہو کر اسی محور و مرکز پر منتہی ہوں گے۔ اور اسی سے سب کا وجود سیراب ہوگا۔

بے دینی کے اسباب

تاریخ ادیان کی کتابوں میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب تھے جنکی بنا پر لوگ دین کی طرف مائل ہوئے لیکن یہ نہایت ہی غلط اور ناقص طریقہ ہے جس سے کبھی بھی انسان واقعیت کی طرف نہیں پہونچ سکتا اور نہ حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت توحید کو دیکھتے ہوئے — یعنی نوع انسان کی وہ خصلت وجودی جو دیگر انسانی صفات مثلاً فکر، ارادہ، استعدادات متقابلہ کے درمیان ایک خاص اہمیت کی حامل ہے — ان اسباب کو تلاش کرنا چاہئے تھا کہ جن کی وجہ سے انسان اپنی فطرت کے خلاف بے دینی کی طرف چلا گیا ہے۔

دینی علاقہ ایک فطری چیز ہے اور مادہ پرستی خلاف فطرت ہے۔ اگر انسان اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر خدائے برحق تک نہیں پہونچ پاتا تو اپنے لئے ایک خدا تراش لیتا ہے۔ چاہے وہ بے شعور مادہ ہو یا جبر تاریخ ہو۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی باطل خدا، خدائے برحق کی جگہ لے لیتا ہے اور پھر اسی کے فرمان، قضاوت، ہدایت، ارائہ طریق میں وہ اسکی پابندی کرنے لگتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ انسان خدائے برحق کو چھوڑ دیتا ہے اور قدیم یا جدید بت پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور پھر بڑی قساوت و بے دردی سے خدا کو خدایان تاریخ کے قدموں پر قربان کر دیتا ہے۔ اور جواہرات دیکر مٹی خرید لیتا ہے۔

اور سب سے زیادہ افسوس تو اس بات پر ہے کہ پسماندہ طبقہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے تمام خدائی صفات کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اور خدا کو وحدہ

لاشریک لہ سے اعراض کر لیتا ہے اور اس ننگ آلود عبودیت کو جان کی بازی لگا کر خرید لیتا ہے۔

اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادیت کا ظہور یورپ میں بعنوان ایک مکتب اور حقیقتِ مطلقہ سے علاقۂ انسانی کو جدا کرنے کے لئے ہوا تھا اور اس لئے ہوا تھا کہ انسان کو مادہ کی زنجیروں میں گرفتار کر دیا جائے اور مذہب کی جگہ اس مادہ کو دے دی جائے اور یہ سارا کام کچھ تاریخی و اجتماعی اسباب کی بنا پر کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے مغرب میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔

من جملہ ان اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس وقت نئی صنعتی ترقی شروع ہوئی اور ان علماء نے ایسے عقائد و آرائے جدیدہ کا اظہار کیا جو مسیحی علماء کے نظریات کے خلاف تھے تو مسیحی علماء نے اس کے ابتدائی دور میں بڑی شدت سے ان لوگوں کی مخالفت شروع کر دی جس کا ردعمل یہ ہو رہا تھا کہ موحدین نے دین و دیانت کا علی الاعلان انکار کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ طاقتور ہوتے گئے اور مسیحی علماء کی ان کے مقابلہ میں ایک نہ چلی۔

کلیسا — مخصوص دینی عقائد کے علاوہ — قدیم یونانی و غیر یونانی فلاسفہ کے اصول و نظریات کو انسان و کائنات کے سلسلہ میں، وثاقتی طور پر مانتا تھا اپنے دینی اصول و عقائد کے ساتھ ساتھ — لیکن جب کلیسا نے کچھ ایسے نظریے دیکھے جو کتاب مقدس اور ان کے دیگر مسلّم و مقبول اصول کے خلاف تھے تو انھوں نے — یعنی کلیسا نے — اپنے مخالف نظریہ والے کو کافر و مرتد قرار دے دیا اور اس کے لئے سخت ترین غیر انسانی سزائیں مقرر کر دیں۔

علمی و مذہبی محافل میں جب علم جدید و مذہب کا تضاد ظاہر ہونے لگا تو طرفین میں مخاصمت و مخالفت کا جذبہ بھی شدید ہونے لگا۔ روشن فکر و دانشمند طبقے نے دیکھا کہ مسیح کا کلیسا عقل و فکر کو پابہ زنجیر کرنا چاہتا ہے اور حریت و آزادی فکر کو چھیننا چاہتا ہے اور پھر نتیجۃً اس جامد نظامِ فکری نے عصر جدید کے انسان کے لئے خلافِ عقل ایک زہریلی فضا پیدا کر دی اور صاحبانِ فکر و نظر کو گوشہ گمنامی میں بٹھا دیا۔ اور اس مسلسل فشار نے پورے یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور پھر جب کلیسا کا اقتدار ختم ہوگیا اور ظلم و بربریت کے بادل چھٹ گئے

تو عصر جدید کے علماء جو گوشہ گمنامی میں قید و بند کی سختیاں گزار رہے تھے انہوں نے ماضی کی تلخیوں کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ اور جتنے بھی روشن خیال لوگ تھے انھوں نے قدیم مذہب کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور مذہب سے برگشتہ ہوگئے اور پھر عصبیت مذہب جا نکا ہی کی ایک عظیم موج مذہب کے خلاف قائم ہوگئی اور شدید معنوی بحران کا آغاز ہوگیا اور اس کا نتیجہ علم و ایمان کی جدائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی غیر منطقی انتقام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اصلی آسمانی مسائل اور وجود خدا کی حقیقت کا انکار کر بیٹھے۔

یہ درست ہے کہ دین کی بعض تعلیمات غیر منطقی تھیں بلکہ بے بنیاد تھیں اور اصل دین سے ان کا کوئی ربط بھی نہیں تھا مگر کلیسا سے انتقام لینا ایک الگ بات ہے اور جلد بازی اور غلط کاری کی وجہ سے بطور عموم دین ہی کا انکار کر دینا ایک الگ چیز ہے۔ اور یہ بدیہی بات ہے کہ انتقام لیتے وقت علمی محاسبہ کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا اور اس وقت کی فضا میں جو چیز حکومت کرتی ہے وہ صرف احساسات کا طوفان ہوتا ہے۔

اس وجہ سے انسان کا فقر معنوی بہ نسبت ٹیکنیکل و علمی استغنا کے زیادہ ہوگیا اور انسان صنعتی سرزمین پر جتنا بڑھتا گیا اخلاق و معنویات میں پیچھے ہوتا چلا گیا اور پھر ضروری قدرت معنوی کو ان علوم و معارف سے حاصل نہ کر سکا۔

ارزش و معنویت کے مقابلہ میں علوم بذات خود زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں کیونکہ ہم صنعتی علوم کی طرف مراجعہ کرکے مسئولین افراد کا وظیفہ و فریضہ معین نہیں کر سکتے۔ علوم میں چاہے جتنی ترقی ہو جائے اپنے سامنے ایک قدم سے زیادہ نہیں دیکھ سکتے۔

شناختہائے بشر نہ تو اس کائنات کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہے اور نہ مستقبل میں انسان کے سرنوشت کی پیشین گوئی کر سکتی ہے۔

یہ تو صرف نظریۂ توحید ہے جو صرف انسان کے مادی حیات ہی پر اقتصار نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے لئے مسیر اور بلند غایت بھی معین کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے کو توحید کے راستہ

پر چلتا رہے تو وہ ایسے کلیہ تک پہونچ جاتا ہے کہ اپنے جہان بینی کے چوکھٹے میں اپنے تمام بنیادی اور استفہامی سوالات کے جوابات پالیتا ہے۔ اور پھر انسانی زندگی اپنے رنگ و اصلی قدر و قیمت کو کامل تجلیات کے ساتھ پالیتی ہے اور یہ عقیدہ توحید کے طفیل میں ہوتا ہے۔

خدا کے انکار اور لادینیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے کلیسا کی طرف سے خدا کے بارے میں جو نادرست و نارسا اور ناقدرانہ شبہاتی متعال مفاہیم پیش کئے تھے ان کی وجہ سے اس گروہ نے مذہب سے استعفیٰ دیکر مادیت کے دامن میں پناہ لی۔ کیونکہ خدا کا جو نظریہ کلیسا پیش کرتا تھا وہ روشن دماغ افراد کے لئے وہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا۔ اور نہ قانع کرنیوالا تھا۔ اس لئے کہ کلیسا خدا کو مادی اور انسانی قالب میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جبکہ انسان ہمیشہ اندیشہ ہائے مطلق کے جستجو میں ہے اور محدودیت کے چوکھٹے کو توڑ کر اس سے کہیں بلند و بالا جانا چاہتا ہے تو خدا کو محدودیت کے چوکھٹے میں کیونکر قبول کر سکتا ہے؟

یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اگر مسلم حقیقت کو بھی ناقص اور قصہ کہانی کی طرح ذہنوں میں ڈال دیا جائے تو جب انسان فکر و علم کے عالی مستوی پر پہونچے گا تو اس حقیقت کے تصور سے برے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

روشن فکر حضرات نے جب مسیحی الٰہیات میں خدا کی ایسی تصویر دیکھی اور یہ دیکھا کہ مسیحی مذہب ایمان کو عقل پر مقدم سمجھتا ہے۔ اور دین کے پیروکاروں کو سوچنے سے پہلے ایمان لانا ضروری ہے تو انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا کہ یہ دینی تنگ و محدود نظریات اور مسیحی الٰہیات کے تنگ چوکھٹے میں علم و حکمت کا انحصار میزان عقل و روشن بینی کے حذف ہے اور ان کے سامنے کلیسا اور تحریف شدہ کتابوں کے علاوہ معارف الٰہی کو سمجھنے اور اس قسم کے مسائل میں تحقیق کرنے کی کوئی صحیح اور واقعی پناہ گاہ بھی نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی ایسے بلند و برتر نظام تک رسائی حاصل کر سکتے تھے جو ان کی مادی خواہشات کے ساتھ معنوی ضروریات

کو بھی حل کر سکا ہوتا اور پورا کر سکا ہوتا اور ان کے تمام حیات مادی و معنوی، عاطفی و فکری عناصر کے لئے مناسب قالب پیش کر سکا ہوتا — تو ان کی بینش مادی گری نے ان کے افکار و خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ماورائے طبیعت کسی غیر مادی از شبہائے متعالی کا انکار کر بیٹھے۔ اور اس بات کی طرف متوجہ نہ ہوئے کہ دین جب بھی مسیر جہالت میں پڑ جاتا ہے تو ہمیشہ اشتباہ اور غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے — لیکن جو مذہب سچا ہوتا ہے۔ خرافات، تحریفات، موہومات کے شائبہ سے خالی ہوتا ہے وہ انسان کو قصہ کہانیوں اور خرافات سے نجات دلا دیتا ہے۔ اور صحیح عقیدہ پر ثابت قدم بنا دیتا ہے اور معارف الٰہی کی صحیح و درست تصویر پیش کرتا ہے جو اہل تحقیق کو صحیح جواب دے سکے — اور معقول دلائل سے فکروں اور غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

لیکن اس روشن فکر طبقے نے جب دین کو ایک خرافات اور باطل باتوں پر مشتمل دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ دین کی بنیاد غیر منطقی اصولوں پر رکھی گئی ہے تو ان کو یقین ہو گیا یہ تمام دینی پروگرام عبث و بیکار ہیں — اور اپنے مذہب میں جو چیزیں دیکھی تھیں ان کی بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی مخالفت پر اتر آئے حالانکہ اس بنا پر جلد بازی اور خلاف واقع بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی تردید عقل و منطق سے بعید اور بالکل غلط ہے۔

والٹر اسکار (WALTER OSCAR-L) جو فیزیالوجی اور بیوکیمسٹری[1] کا بہت بڑا عالم ہے وہ اس حقیقت کو اس طرح آشکار کرتا ہے کہ علمی مطالعات میں بعض دانشمندوں کی توجہ وجود خدا کی طرف ملتفت نہیں ہوتی اس کے متعدد اسباب ہیں۔ میں ان میں سے دو علتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں —

۱۔ غالباً اوضاع سیاسی استبدادی یا احوال اجتماعی یا حکومتی تشکیلات وجود پروردگار کے انکار کا سبب بنا کرتے ہیں۔

۲۔ انسانی فکر ہمیشہ بعض اوہام کے تحت تاثیر ہوتی ہے اور اس کے باوجود کہ محقق

---

[1] وہ علم جو خواص اجسام سے متعلق ہو اس علم کے ذریعہ کسی جسم کی ماہیت کو تبدیلی جسم کے بعد دوسری ماہیت میں بدلا جا سکتا ہے۔

کسی بھی قسم کے جسمانی یا روحانی عذاب کا خوف نہیں رکھتا پھر بھی اس کی فکر صحیح راستہ اختیار و انتخاب کرنے میں کاملاً آزاد نہیں ہوتی ——— مسیحی خاندانوں میں زیادہ تر بچے ابتدائے عمر میں ایک ایسے خدا پر ایمان لاتے ہیں جو انسان کے مشابہ ہوتا ہے۔ گویا کہ بشر بصورت خدا پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ افراد جب علمی محیط میں داخل ہوتے ہیں اور علمی مسائل کے یاد کرنے اور مشق کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ انسانی شکل کا ضعیف خدا منطقی دلائل اور علمی معیار پر پورا نہیں اترتا اور جب کسی بھی صورت سے دونوں۔ تعریفی خدا اور منطقی دلائل والا خدا ــ میں اتحاد نہیں پیدا ہو پاتا تو مفہوم خدا کو ترک کر دیتے ہیں اور اس کو دائرہ فکر سے خارج کر دیتے ہیں۔

اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منطقی دلائل اور علمی تعریفات سابق عقائد کو بدل نہیں پاتے اور پھر دوسری طرف یہ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایمان باللہ کے سلسلہ میں ہم نے غلطی کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں جو انسان کو اس دینی مفہوم کے ٹوٹ جانے پر متوحش کر دیتے ہیں اور نتیجہ میں وہ شخص معرفت خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔[1]

یہ وجہ تھی کہ دانشمند حضرات نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ مسائل ہستی و آفرینش میں جہاں کہیں بھی خدا یا مذہب کا نام ہے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اور مستقیم یا غیر مستقیم ایسے قوانین و فارمولے ایجاد کئے جائیں جو ان تمام مقامات کے لئے ــ جہاں پر خدا یا مذہب کا نام ہو ــ علمی محل تلاش کر کے خدا و مذہب کا نام باقی نہ رہنے دیں۔ اور بزعم خود انسانوں کی امیدوں کو دین کے سلسلہ میں ختم کر دیں اور نظام طبیعت یا گردش جہان میں خدا کی کسی بھی قسم کی تاثیر کو نیست و نابود کر دیں۔

اور جب یہ لوگ کسی ایسی جگہ پہونچے کہ جہاں تاویل کا دروازہ بند ہے تو وہاں پر کچھ مختلف مفروضات کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنے کی سعی لاحاصل کی اور یا یہ کہکر ٹال گئے کہ مستقبل میں ہونے والی تحقیقات سے یہ گتھی سلجھ جائے گی۔ اور اس طرح ــ اپنے

---

[1] اثبات وجود خدا ص...

خیال خام میں ہے۔ اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ اس قسم کی خرافات اور غیر علمی مسائل میں کوئی کوشش کریں اس لئے اگرچہ یہ لوگ شرک کی گمراہی سے تو بچ گئے۔ مگر کفر و الحاد کے دلدل میں پھنس گئے۔

اگرچہ خدا کی معرفت اور عقیدہ مبدء فطری وطبعی چیز ہے۔ لیکن مادی زندگی ضروریات کی طرح انسان اس کی تلاش وجستجو میں زیادہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ مسئلہ مادی زندگی سے بالکلیہ متمائز ہے۔ اس میں وقت نظر اور گہرائی فکر کی ضرورت ہے۔ اور قضایا کے اصل تک نفوذ اور مسائل وجود میں تحقیق درکار ہے۔ اور ہر انسان کو مستقلاً چاہئے کہ غور و تدبر سے اس کو حاصل کرے۔ مختصر یہ کہ مادیت اور فکریت میں از نظر ماہیت کوئی شباہت نہیں ہے۔

اور دوسرے نقطہ نظر سے نادیدہ موجود جس کی توصیف بھی ناممکن ہو اس کا انکار کر دینا اس کے وجود کے اعتراضات سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور اسی لئے جن لوگوں کے اذہان اس فکر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اور خصوصاً جبکہ حقیقت ناصری کی شناخت مختلف اسباب وعوامل کی بناپر دشوار ہو گئی ہو تو وہ لوگ بجائے اس کے کہ راہ فکر کو اپنے لئے ہموار کریں ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جو آسان ہو اور اس میں کوئی دردسری بھی نہ ہو اور وہ راہ کفر والحاد کی ہے وہ لوگ اسی کو انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور بحسب ظاہر اس راہ کو اختیار کر لینے میں ان کو کوئی نقصان بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب مسئلہ وجود خدا سے دور ہو جاتے ہیں تو عناد و دشمنی و عصبیت پر اتر آتے ہیں۔ اگر آپ تغیرات کونیہ کا مطالعہ کریں جو دین سے بیزار لوگوں سے بھری ہے تو اس حقیقت کو پالیں گے۔

اور اسی کے ساتھ اس بات سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے کہ جاہل و بے منطق نادان عابدوں اور زاہدوں کی تبلیغات نے بھی بہت سے لوگوں کو دین سے بیزار کر دیا اور وہ لوگ مادہ پرست ہو گئے۔

وہ غرائز جو انسان کی طبعی حیات کے ساتھ شروع اور اسکی موجودیت سے ہم رشتہ ہوتے ہیں وہ نہ تنہا یہ کہ عبث و بے ہودہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک معین کنندہ طاقت و سرنوشت

ساز اور عامل رشد و حرکت ہیں جو انسان کو اس مقصد کی طرف — جو اس کی آفرینش میں منظور تھا — لے جاتے ہیں اور اہم چیز یہ ہے کہ جس طرح انسان کو اپنی خواہشات کا بندہ اس طرح نہ ہونا چاہئے جس طرح قیدی اپنے وجود و حرکات و اختیارات میں داروغہ جیل کا تابع ہوتا ہے اسی طرح اپنی واقعیت درونی سے بھی جنگ نہ کرنی چاہئے اور نہ فطرت کی ہر دوڑ دھوپ ہر تلاش و حرکت کو روکنا چاہئے۔ بلکہ نہاد انسانی کا فائدہ بخش ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آدمی کے وجود میں فعالیت ہمہ وقتی ہو۔ مگر اپنے ترکیب واعمال میں معتدل و متوازن ہو ورنہ غرائز کی سرکوبی بھی مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور انسان کی شخصیت کو ویران بنا دیتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں کلیسا کے پیش نظر صرف اور صرف آخرت تھی۔ یعنی مادی دنیا ہیچ و لا یعنی تھی۔ آپ ذرا غور کیجئے مذہب و خدا کے عنوان کے پیش نظر اگر ہم فطری خواہشات کو غیر اہم بلکہ اس کو نابود فرض کر لیں اور رہبانیت و تجرد کو مقدس مان لیں۔ اور شادی بیاہ اور تشکیل خانوادہ — جس کے زیر سایہ بقائے نسل کا امکان ہوتا ہے — کو گندی اور نجس چیز فرض کر لیں۔ فقر و ناداری کو مایہ سعادت سمجھنے لگیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور دوسرے لوگ ایسے مذہب کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ اور اس سے کتنی امیدیں وابستہ کریں گے؟

مذہب کا مقصد اصلاح و رہبری، خواہشات پر تسلط، اعمال انسانی کو کمی اور زیادہ روی سے محفوظ کرنا اور اس کے دائرہ خواہشات کو محدود کرنا ہے تاکہ بالکل نیست و نابود کر دینا ہے۔

انسان اگر اپنے غرائز کو کنٹرول میں رکھے اور خواہشات کے جال میں گرفتار ہونے کے بجائے برابر اس سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے با مقصد سرنوشت کو بنا سکتا ہے، اور نہ انسانی فطرت میں خواہشات کی کشمکش کی شدت اس درجہ ہے کہ جب تک انسان کو ہر طرح کی تربیت نہ دی جائے سادگی و سہولت کے ساتھ وہ اپنے اندرونی خواہشات کو مسخر نہیں کر سکتا۔

انسان ایک طرف تو جذبہ دین سے متاثر ہوتا ہے اور دین باطنی طور پر اس کو خیر و صلاح کی طرف آمادہ کرتا ہے مگر دوسری طرف سے انسان خواہشات نفسانی سے بھی شدید طور سے متاثر ہوتا ہے ——— یاد رکھئے جس معاشرہ میں خدا اور دین کے نام پر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائیگا کہ تمہاری سعادت و خوشبختی کا دار مدار مواہب دنیویہ سے کنارہ کشی ہی میں منحصر ہے۔ وہاں قہری طور پر انسان ایک فشار و تنگی محسوس کرے گا اور وہ طبعی طور سے مادیت کی طرف رخ موڑ لیگا اور دینی مفاہیم سے بالکلیہ برگشتہ ہو جائیگا۔

اور درحقیقت دین کی منطق یہ ہے بھی نہیں! بلکہ حقیقی دین انسان کو نفس کی غلامی اور مادہ کی بندگی سے آزاد کرتا ہے۔ اور ذات خدا پر ایمان اور دینی و دنیاوی تعلیم کی بنیاد پر انسان کو اصلی و معنوی ارزش کی طرف متوجہ کر کے عالم ملکوت کی رویت کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ مادی لذائذ سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تمام وہ چیزیں جو مذہب کی طرف سے ممنوع قرار دی گئی ہیں درحقیقت ان ہی آزادی کا ہونا ہی مایہ سعادت و خوشبختی ہے اور دین تو بڑی سختی کے ساتھ خوشیوں سے روکتا ہے اور کسی بھی طرح لذات دنیا کو حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ انسان یا تو دنیا کی خوشیوں کو حاصل کرلے یا پھر صرف آخرت کی خوشیوں کو حاصل کرے ——— حالانکہ یہ طرز فکر بھی مذہب سے گمراہ کرنے کا ایک آلہ ہے اور قطعاً خلاف واقع ہے۔

درحقیقت انسانی اقدامات میں دین کی مداخلت کی وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی قید و شرط کے حصول لذات کی آزادی، خواہشات نفسانی کے سامنے خود سپردگی، فطرت و طبیعت کے احکام کے مطابق حرکت و سلوک یہ چیزیں لاشعوری طور پر حیات انسانی کی ہلاکت اور شعور کا سبب بنتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقام واقعی سے گر جاتا ہے، اور پاکیزہ فطرت کے برخلاف حق کے راستہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ محرمات انسانی

سقوط کا سبب اور ابدی بدبختی کا سبب نہ ہوتے تو ہرگز حرام نہ کئے جاتے۔ محرمات کی حکمت کا اندازہ اس طرح سے کیا جا سکتا ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت کی سعادت کا راز معلوم کیا جا سکتا ہے۔

یہی صورت واجبات کی ہے کیونکہ عبادتوں کا وجوب اور ان کا بے ریا ہونا یہ انسان کے فائدہ کے لئے ہے اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی دنیاوی خوشبختی کو ختم کر دے۔

قلب انسان کے آب راکد میں عبادت ایک طوفان کا کام دیتی ہے۔ عبادت درون فطرت اور معیار اندیشہ کو متغیر کر دیتی ہے۔ بلکہ عبادت ایسا سنگ زاویہ ہے جس پر دین کی بنیاد استوار ہوتی ہے اور ایسا تمرینی و تربیتی پر بار قسم کا عمل ہے جو دل کی گہرائیوں تک نفوذ کر جاتا ہے اور ایسی دو دھاری تلوار ہے جو تمام فساد کے درون اور اندرونی پستی کو کاٹ دیتی ہے اور انسانی شخصیت کو دنیائے نہایت وگستردہ تک پرواز کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور انسان کے لئے رشد و بالندگی کو ممکن بناتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ معنویات اور مسائل حیات میں کوئی عبادت کوئی تناقض نہیں پیدا کرتی بلکہ ایک سعادت مندانہ زندگی عطا کرتی ہے۔

اور شاید مسیحی تعلیمات کے نقص و غیر منطقی ہونے کا نتیجہ ہے کہ رسل جیسے افراد لوگ یہ کہنے لگے کہ دین اور خدا پر عقیدہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان ہلاک و بدبخت ہو گیا چنانچہ وہ کہتا ہے: کلیسائی تعلیم انسان کو دو بدبختی اور دو محرومی سے ایک کے درمیان ڈال دیتی ہے یا تو دنیا کی بدبختی اور اس کی نعمتوں سے محرومی یا آخرت کی بدبختی اور اس کی نعمتوں اور حور و قصور سے محرومی۔ کلیسا کی نظر میں ضروری ہے کہ انسان ان دونوں بدبختیوں میں سے ایک کو اختیار کرے یا تو دنیا کی بدبختی اختیار کرے اور خود کو محروم و گوشہ نشین بنا لے۔ اور اس کے بدلے میں آخرت ـــ دوسری دنیا ـــ کی لذتوں سے بہرہ مند ہو۔ یا اگر دل چاہے تو دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھائے تو پھر یہ طے کر لے کہ آخرت میں محروم ہی محروم رہنا ہے۔

اس قسم کے افکار کا نشر ہونا مذہب کی عمیق فکر سے بے خبری کی دلیل ہے اور اس سے مذہب و آئین کی سرنوشت کا اندازہ مستقبل میں کیا ہوگا بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

دین کے بارے میں اس قسم کے تصورات کا اثر انسانی اعمال و افکار پر کتنا گہرا ہوگا اس کو علمی نظر سے سوچ کر گزرا نہیں جا سکتا۔ اسی طرز تفکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری یا لاشعوری طور پر انسانی توجہات صرف مادیات پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور اس بالکلیہ توجہ کے نتیجہ میں معنویات و اخلاق کی دیواریں کمزور سے کمزور تر ہو گئیں۔

اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انسان دو حقیقتوں میں ایک کو بہرحال قبول کرے۔ بلکہ انسان کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل کرے۔ اور بھلا وہ خدا جس کی رحمت وسیع ہے وہ اپنے بندوں کے لئے سعادت دنیا و آخرت کو کیوں نہ چاہے گا؟ یقیناً خدا اپنے بندوں کے لئے دونوں جہاں کی سعادتوں کو چاہے گا۔

افکار مادی کی وسعت کی دوسری وجہ شہوت مالی اور خواہشات میں ڈوب جانا ہے، جس طرح مرقد ہی فکر عمل کی بنیاد بنتی ہے اور نظری عقائد انسان کی زندگی میں اس کے خط سیر کو معین کرتے ہیں اسی طرح عمل و اخلاق بھی کیفیات ذہن کو متاثر کرتے ہیں بلکہ فکر کی بنیاد بدل دیتے ہیں۔

شہوت پرست انسان تدریجی طور پر خدا پرستی کے بلند و بالا افکار کو اپنے ہاتھ سے دے دیتا ہے اور جس دن وہ اپنے لئے خدا کے علاوہ کوئی اور محور عملی اختیار کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ آزاد ہے اور اپنی خلقت کے ہدف و غایت کو قبول نہیں کرتا بلکہ وہ سمجھ ہی نہیں پاتا لہٰذا اپنی تمام کوشش لذت و شہوت کے حصول میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور پھر اس ذلت آمیز سقوط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی روح کے جذ بہ ہو مائل بکمال تھے خشک ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح خدا پرستی کا عقیدہ بھی ایک بیج کی طرح ہے جو ایسی زمین کو چاہتا ہے جو اسکی نشو و نما میں مدد دے۔ اور یہ بیج پاک و پاکیزہ محیط میں پھوٹتا ہے۔ ایسا محیط کہ

جس میں انسان کے لئے یہ ممکن ہو کر محفوظ ہو کر جو کھٹے میں رہ کر اپنے اصلی خطوط کو معین کرتے ہوئے سہولت و سرعت کے ساتھ اپنے بلند و برتر کمال کو حاصل کر سکے۔ اگر خدا پرستی کا عقیدہ ایسے ماحول میں ہے جو اس کے لئے ناسازگار ہے تو کبھی بھی نتیجہ بخش نہ ہو گا۔

زندگی کی ہما ہمی اور غوغا، مشینی و صنعتی پیداوار کی کثرت، ثروت و قدرت کی زیادتی کمال و جمال کا ہر جگہ وجود، شہوتوں کے وسائل کی فراوانی نے انسان کو اتنا غافل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا ہے اور وہ اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کرتا ہے کہ اپنے کو دین و دیانت اور اس کے مسائل سے کسی بھی طرح بچا سکے اور کسی بھی قیمت پر کنٹرول کرنے والی طاقت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ کوئی مادی نفع نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے ہوس و خواہش کے طوفان کے سامنے وہ ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اسی لئے جس جگہ کے لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوں اور قید و بند سے آزاد ہوں اور عمل و کردار میں کسی ضابطے کے پابند نہ ہوں وہاں پر صرف مذہب کا نام ہی نام باقی رہ سکتا ہے اور کام چور اور مادہ پرست حضرات کبھی بھی خدا جو اور خدا پرست نہیں ہو سکتے۔ اور فطری بات ہے کہ مادی اور الٰہی دو فکروں میں جب ایک فکر فضا پر چھا جائے گی یعنی انسانی ذہن میں بیٹھ جائے گی تو دوسری فکر کی وہاں جگہ ہی باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا یا تو مادی خواہشات روح عبودیت خدا کو انسان سے دور کر دیں گی اور یا عبودیت خدا مادیت کو بھگا دے گی اور جب خواہشات نفس مغلوب ہو جائیں گی اور سعی مسلسل الٰہی مقاصد کی طرف انسان کو لے جائے گی تو انسان اپنے مادی اقدامات کو ترک کر دے گا اور فطرت کے قید و بند سے آزاد ہو کر انسانی حریت کا ایک کامل نمونہ بن جائے گا۔

اور انسان کا ہدف جتنا بلند اور دور ہوتا ہے اس کی طرف چڑھنا اور اس کے لئے کوشش کرنا بہت زیادہ اور طولانی ہوتا ہے پس اگر ہم خدا کو اپنا ہدف بنا لیں تو وہ ہدف و مقصد بھی بہت بلند ہے اور اس تک پہونچنے کا راستہ بھی بے انتہا روشن و مستقیم ہے۔ اور

بہت سے مسائل و مشکلات کا جواب دنیا بھی آسان ہو جائیگا - اور نفی طاغوتِ نفس کے زیر سایہ آزادی بھی جنم لے گی -

اگر ہم خدا کو بعنوان مقصد و ہدف قبول کریں تو تکامل و آزادی کے درمیان تفاہم بھی ہو جائیگا اور تکامل کی خاطر بشر جو رنج برداشت کرتا ہے اور جو تلاش و جستجو کرتا ہے وہ حیاتِ ابدی کے عقیدہ اور انگیزہ الٰہی کے ساتھ اپنے مفہوم کو حاصل کرے گا - خدا کی بندگی سے جو تکامل حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو حریت سے ٹکراتا ہے اور نہ انسان کی غلامی و بندگی کا سبب بنتا ہے -

ہم اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتے ہیں جب ہمارے ساتھی کائنات کے سیرِ تکامل میں عزم محکم و تشخیص صلاحیت کے ساتھ شریک ہوں - فطرت کے دستور یا تاریخ کے جبر کی بنا پر نہ ہوں - کیونکہ فطرت کی خواہش کے مطابق ساتھ دنیا مصلحت و منفعت کے برخلاف ہو کر فطرت کی اسیری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے - اور جو تکامل جبر و اکراہ کے ساتھ فطرت کی پیروی کر کے حاصل ہو وہ ایک اندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں ہے -

مکتبِ مادی جو تکامل و سعادت، فطرت کے قید و بند سے خارج ہو جانے کو سمجھتا ہے -
ہم اس مکتب میں حریت و تکامل کے درمیان تناقض محسوس کرتے ہیں - جس تکامل کو انسان بطور وظیفہ اور بڑی کوشش و تلاش سے اس کی پیروی کرے لیکن اس کے آئندہ نتائج و ثمرات سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے وہ کیا مفہوم اور کیا معنی رکھتا ہے ؟

کیا سعی و کوشش ــــ اگرچہ انسانی عوامل کی بنیاد پر ہو ــــ اس شخص کے لئے جو مبدأ و معاد کا قائل نہ ہو لغو اور بیکار نہیں ہے ؟ چاہے وہ معاشرہ کے لئے کتنی ہی ثمر بخش اور مفید ہو - کیا وہ ایک لغو اور غیر منطقی عمل محسوب نہ ہو گا ؟

اگر میری قربانی کمالِ انسانیت اور تکاملِ نوعِ بشر کے لئے ہو - لیکن اس قربانی سے شخصی طور پر مجھے کوئی فائدہ نہ پہونچے تو یہ مقصد خلافِ حریت بھی ہے اور خلافِ منطق و عقل بھی !

مادی مدرسہ کے زعماء جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تکامل و قید و بند کے درمیان ایک کشمکش

تضاد ہے۔ ان کی نظر در حقیقت اسی مادی تکامل کی طرف ہے جو الٰہی نہیں ہے اور واقع و نفس الامر میں جس کا کوئی مقصد و ہدف نہیں ہے۔

خدا کے صفات اور خصائص

قرآن خدا کی کس طرح توصیف کرتا ہے؟

جس وقت ہم کسی علمی شخصیت اور دانشمند مولف کی حدود معلومات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کے علمی آثار کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کو مورد تحقیق قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم کسی فنکار کی قدرت و استعداد کا اندازہ لگانا چاہیں تو اس کی فنی نتوحات اور مصنوعات کی تحقیق کرنی پڑے گی۔

اسی طرح اگر ہم خدا کے صفات و خصائص کا ادراک کرنا چاہیں تو اس کے موجودات و مخلوقات میں تدبر کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر اپنی حسب حیثیت خالق کی حکمت و حیات و قدرت و علم کا اندازہ لگا پائیں گے۔

اگر بحث یہ ہو کہ خدا کی ہر لحاظ سے اور مکمل طور سے معرفت حاصل کرنی چاہئے تو پھر ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ انسانی قوت معرفت اتنی جامع شناخت پروردگار پر قادر نہیں ہے اور نہ ہی اسکی خصوصیات کے حدود و سرحد کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر قیاس و تمثیل غلط ہے کیونکہ پوری کائنات میں بشر کے لئے علمی و فکری لحاظ سے جو چیز مشہود ہے وہ سب کی سب خدا کی مصنوع اور اسکے امر و ارادہ کی محصول ہے اور خود اسکی ذات نہ جزء طبیعت ہے اور نہ اس کے مخلوق کے سنخ سے ہے تاکہ اس قسم کے وجود کی ماہیت کا ادراک از روئے قیاس ممکن ہو سکے۔

خدا ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی معرفت ذات کے لئے نہ تو کوئی مقیاس ہے اور نہ اس کی قدرت یا علم کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی عدد ہے اور نہ ہی احصا کا کوئی طریقہ ہے پھر کیا ایسی صورت میں اس کی حقیقت ذات یا صفات کا ادراک کرنے کے لئے انسان عاجز و

حقیر نہیں ہے۔ !

لیکن کامل و وسیع و عمیق معرفت کی عاجزی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی بھی طرح اسکی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے یعنی معمولی معرفت بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کیونکہ نظام وجود وسیع ہو کر اس کے صفات کو بتا رہا ہے۔ اور ہمارے بس میں یہ بات ہے کہ مظاہر فطرت و جمال طبیعت میں غور کر کے اس کی قدرت و ابداع کو پہچان لیں۔ ارادہ و شعور، علم و آگاہی، نظام وجود میں ہم آہنگی، زندگی کے گوناگون مظاہر ہمارے لئے اس امکان کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ مفاہیم مذکورہ اور تمام وہ چیزیں جو مقصد و ہدف کی حکایت کرتی ہیں یہ کسی ایسے خالق کے ارادہ کی تابع ہیں جو ان تمام خصائص سے متصف ہے اور جسکے قبضۂ قدرت میں یہ بھی ہے کہ اس عالم کے موجودات کو برعکس کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز خدا کی شناخت کر سکتی ہے اور اس کے وجود کو لمس کر سکتی ہے۔ وہ وہی عجیب و غریب قوت فکر ہے جو اسی منبع لایزال کے فرمان کی ایک تجلی ہے جو مادہ پر چمکی ہے اور وہی فرمان ایزدی ہے جس نے فکر کو ادراک معنی اور نفوذ الی الحقیقۃ کی طاقت بخشی ہے۔ اور اسی موہبت عظیمہ سے معرفت حق متجلی ہوتی ہے۔

●

اسلام میں خدا کی معرفت جدید اور واضح بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ اور قرآن — جو مصدر و ماخذ ہے شناخت جہان بینی اسلام کے لئے — اس مسئلہ کا حل بطور سوال و جواب نفی و اثبات کے درمیان کرتا ہے۔ قرآن پہلے تو واضح دلیلوں سے پروردگاران باطل کی نفی کرتا ہے کیونکہ توحید تک پہونچنے کے لئے شرک اور ماسوی اللہ کی بندگی کے حجابات کا اٹھانا ضروری ہے۔ اور یہ پہلا قدم ہے جو توحید تک پہونچنے کے راستہ کو ہموار کرتا ہے۔

قرآن اعلان کرتا ہے:

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۖ هَٰذَا ذِكْرُ مَنْ

مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ (انبیاء/۲۴)

کیا ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں؟ (اے رسول) تم کہو کہ بھلا اپنی دلیل تو پیش کرو جو چیز (دنیا میں) ہیں۔ ان کی کتاب (قرآن) اور جو لوگ مجھ سے پہلے تھے ان کی کتابیں (توریت وغیرہ) یہ (موجود) ہیں (ان میں خدا کا شریک بتا دو) بلکہ ان میں سے اکثر تو حق (بات) کو جانتے ہی نہیں (تو جب خدا کا ذکر آتا ہے) یہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔

نیز اعلان کرتا ہے:-

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (مائدہ/۷۵)

جس شخص کا علاقہ توحید سے ختم ہو جاتا ہے وہ عالم وجود میں اپنے رابطہ اور موقعیت کو بھول جاتا ہے اور خود اپنے سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اپنے کو گم کر دیتا ہے۔ اپنے سے بیگانگی کی آخری صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان فطرت انسانی سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ اور مختلف اندرونی و بیرونی عوامل کی تاثیر کی وجہ سے انسان اپنی ذات و فطرت سے اجنبی ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات سے اجنبی ہو جاتا ہے تو اپنے خالق سے منقطع ہو جاتا ہے اور دوسرے کی بندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور عقل و منطق کے بدلے اس بندگی کو قبول کر لیتا ہے اور یہی چیز مثلاً ہر طبیعت کو خدا بنا لینے کی طرف بازگشت ہے۔ اب خواہ ہم بتوں کو سجدہ کریں یا اصالت مادہ کے قائل ہو جائیں دونوں باتیں ارتداد اور رجعت قہقری ہیں اور یہ چیز انسان سے کامل رشتہ کو چھین لیتی ہے۔

ایسی صورت میں توحید ہی وہ تنہا قوت ہے کہ جس کے ذریعہ انسان اپنی موقعیت کو واپس پا لیتا ہے اور طبیعت انسانی اور ماہیت ہستی سے ہم آہنگی کے ذریعہ اپنے وجود کو کمال بخشتا ہے

تاریخ میں دیکھئے تمام نبوتیں اور آسمانی الٰہی رسالتیں الوہیت و ربوبیت و توحید کا پیغام لیکر اپنے مشن کا آغاز کیا کرتی تھیں۔ انسانی لغات کے اندر توحید سے زیادہ پر معنی لفظ دیکھی ہی نہیں گئی

جو اپنے دامن میں ایسے سازندہ مفاہیم لئے ہوئے ہے جو حیات انسانی کے مختلف گوشوں پر محیط ہے اور اس کو تحریفات سے بچاتی ہے۔

قرآن واضح دلائل کے ذریعہ ذات مقدس ربوبی کی شناخت و معرفت کے راستہ بتاتا ہے مثلاً ارشاد ہے:۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ؟ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ؟ بَلْ لَا يُوقِنُونَ (الطور/۳۵-۳۶)

کیا یہ لوگ کسی کے (پیدا کئے) بغیر ہی پیدا ہوگئے ہیں یا یہی لوگ (مخلوقات کے) پیدا کرنیوالے ہیں۔ یا انھوں نے ہی سارے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں (نہیں) بلکہ یہ لوگ یقین نہیں رکھتے:

قرآن نے دو مفروضوں کے بطلان کو عقل و فطرت سلیم کے حوالے کر دیا ہے:

۱۔ انسان خود بخود عدم سے وجود میں آگیا۔

۲۔ انسان خود اپنے کو پیدا کر سکتا ہے۔ تاکہ انسان اس کو اپنے عقلی معیار پر پرکھے اور اس کی تحلیل کرے۔ اور آیات الٰہی میں غور کر کے قطعی اور یقینی صورت سے منبع وجود کا اقرار کرے۔ اور یہ سمجھ لے کہ کائنات کا وجود ایک مدبر و منظم کے بغیر ناممکن ہے۔

دوسری آیتوں میں تدریجی پیدائش اور کیفیت تخلیق کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بدیع آفرینش اپنی عجیب صنعت و تدبیر کے ساتھ اس خداوند قدوس کے آثار اور اس کی نشانیاں ہیں جس کی قدرت اور جس کا ارادہ لامحدود ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ (المومنون/۲۳، ۱۲، ۱۴)

اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو ایک جگہ (عورت کے رحم) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم ہی نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم ہی نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تو (سبحان اللہ) خدا بابرکت ہے۔ جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے۔

جس وقت جنین نقاشی وصورت بندی کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ تمام اعضا آنکھ، کان مغز اور دیگر اعضا اپنے مخصوص وظیفہ کو اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ قرآن انسانوں کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ کیا یہ عجیب و غریب تحولات خدا کے بغیر معقول اور قابل قبول ہیں ؟ یا یہ ظواہر قطعی طور سے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا وجود دقیق نہیں، صحیح قیادت، عالم ارادہ معین پروگرام پر مبنی ہے ؟ خلاصہ یہ کہ کیا سلولہائے بدن کسی بزرگ مدیر کے بغیر اپنے وظیفہ سے آشنا ہو جاتے ہیں ؟ اور اپنے مقصد کو اس دقیق و منظم، حیرت انگیز طریقہ سے جہان ہستی میں تشکل کرتے ہیں ؟ قرآن خود اس کا جواب دیتا ہے :

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (حشر / ۲۴)

وہی خدا (تمام چیزوں کا) خالق، موجد، صورتوں کا بنانے والا ہے۔

بس وہی اجزائے اصلیہ کا خالق ہے اور وہی ہر عضو کے اجزاء کا پیدا کرنیوالا ہے اور وہی صور مختلفہ کا مصور ہے۔

ڈاکٹر کارل (Dr. Carrel) کہتا ہے :

" اعضاء کی ترکیب بچوں کو سنائے جانے والے قصوں اور کہانیوں میں جنات سے زیادہ

سلے سلول کے معنی اسی زندہ و حساس و متحرک موجود کے ہیں جو زندہ موجودات کے بدن کا اصل عنصر تشکیل دیتے ہیں سلولہا چھوٹے ہے۔

مشابہ ہیں۔ اور یہ سلولہائے بدن کا کارنامہ ہے جو گویا اس بات سے واقف تھے کہ اعضا کو اس شکل وصورت میں ہونا ہے اور یہ اپنے محیط داخلی کی مدد سے طرح ساختمان اور مصالح کا گراں کو آمادہ کرتے ہیں۔[1]

ہر اس محسوس چیز کو جسے انسان اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ ان کے بارے میں قرآن بہ عنوان مسائل اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے بارے میں دقت نظر سے سوچنا چاہئے اور نتیجہ حاصل کرنا چاہئے ارشاد ہے:-

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (بقرہ/۱۶۳، ۱۶۴)

اور تمہارا معبود تو وہی یکتا خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔ بیشک آسمان و زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) دریا میں لے کر چلتے ہیں اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو مردہ (بیکار) ہونے کے بعد جلا دیا (شاداب کر دیا) اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلانے میں اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان (خدا کے حکم سے) گھرا رہتا ہے۔ (ان سب باتوں میں) عقل والوں کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔

[1] انسان موجود ناشناختہ

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؟ (یونس/۱۰۱)

(اے رسولؐ) تم کہدو کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ آسمانوں اور زمین میں (خدا کی نشانیاں) کیا کچھ نہیں۔

قرآن تاریخ بشر، اس کے تحولات، گزشتہ قوموں کے حالات کو صرف اس لئے بیان کرتا ہے کہ یہ معرفت کے مخصوص مصادر ہیں اور انکشافِ حقیقت کے لئے مختلف امم سابقہ کے فتوحات، ناکامیابیاں، عزت، ذلت، خوش بختی، بدبختی کا بھی ذکر کرتا ہے تاکہ قوانین کی معرفت اور دقیق و منظم حسابہائے تاریخی کی شناسائی سے انسان خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور انسانی معاشرہ کیلئے بھی سود مند ہو چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (آل عمران/۱۳۷)

تم سے پہلے بہتیرے واقعات گزر چکے ہیں پس ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کہ (اپنے اپنے وقت کے پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

نیز ارشاد ہے :-

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ، وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (انبیاء/۱۰)

ہم نے تو تم لوگوں کے پاس وہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے جس میں (تمہارا بھی) ذکر خیر ہے تو کیا تم لوگ (اتنا بھی) نہیں سمجھتے اور ہم نے کتنی بستیوں کو جن کے رہنے والے سرکش تھے برباد کر دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

قرآن مجید نفس انسانی کو بھی سود مند فکر اور کشفِ حقیقت کے لئے ایک دوسرا منبع قرار دیتا ہے اور اس کی اہمیت کا اس طرح اعلان کرتا ہے :-

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (سجدہ/۵۳)

ہم عنقریب ہی اپنی (قدرت کی) نشانیاں اطراف عالم میں اور خود ان میں بھی دکھا دیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات ۲۱)

اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تم میں بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

یعنی یہی تناسب و زیبا جسم اپنے فعالیت و فعل و انفعال اور دقیق و ظریف تکنیک کے ساتھ کہ جس میں غرائز و قوتوں کے انواع، انسانی و حیوانی متنوع احساسات و عواطف و ادراکات خصوصاً حیرت انگیز قوت تفکر کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اور ابھی تک بشر نے غیر مرئی اور معنوی قوتوں کی راہ کے شناخت میں، اور اس کی جسم مادی کے ساتھ کیفیت ارتباط کے سلسلہ میں چند قدم سے زیادہ ترقی نہیں کی۔ اور ابھی تو اس میں معرفت کے فیاض منابع موجود ہیں۔

قرآن اعلان کرتا ہے کہ اگر تم اپنے نفس ہی میں غور و فکر، تحقیق و تفتیش کرو تو تم کو منبع لازوال و غیر محدود بے نیاز اور توانائی بے پایاں تک پہونچا دے گا یہ جان لو کہ وہ حقیقت غیر متناہی ہے کہ جس نے ایسے پربار مجموعہ کو مکمل وحدت کے ساتھ ایک جگہ مرکب کیا ہے اور عرصہ ہستی میں لے آیا ہے۔

اس لئے ایسی زندہ نشانیوں اور حجج قاطعہ کے بعد جو خود تم میں ودیعت کی گئی ہیں اور تمہارے اختیار میں ہیں، عدم معرفت خدا کے سلسلہ میں تمہارا کوئی بہانہ اور کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔

قرآن الٰہی صفات کے بارے میں بھی نفی و اثبات کی روش سے استفادہ کرتا ہے۔ یعنی خدا کے کچھ صفات ایسے ہیں جن کا وہ دارا ہے — صفات ثبوتیہ — جیسے علم، قدرت، ارادہ اور وجود خدا نہ تو مسبوق بالغیر ہے اور نہ مسبوق بالعدم اور اس کی ذات کا کوئی آغاز نہیں ہے۔ کائنات گردش میں ہے۔ مگر سوائے اس خدا کے امر و ارادہ و قدرت کے کسی سے طاقت و قوت نہیں نہیں حاصل کرتی۔

قرآن کا ارشاد ہے :-

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (حشر ۲۲-۲۳)

وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے وہ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں (حقیقی) بادشاہ، پاک ذات (ہر عیب سے) بری امن دینے والا نگہبان، غالب، زبردست بڑائی والا، یہ لوگ جس کو (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں اس سے پاک ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (الصافات/۱۸۰)

یہ لوگ جو باتیں خدا کے بارے میں بنایا کرتے ہیں ان سے تمہارا پروردگار عزت کا مالک پاک صاف ہے۔

اور یا پھر خدا کے صفات منفی ہیں جن سے خدا مبرا ہے — صفات سلبیہ — مثلاً خدا نہ جسم ہے نہ مکان رکھتا ہے، نہ شریک رکھتا ہے، مادی سرحدوں کا اسیر نہیں ہے نہ والد ہے نہ مولود، اس کی ذات میں حرکت و تغیر کا وجود نہیں ہے کیونکہ وہ کمال محض و فعلیت ہے۔ آفرینش مخلوقات کا کام کسی کے سپرد نہیں کیا ہے۔ قرآن میں ہے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص/۱-۴)

(اے رسولؐ) تم کہدو کہ خدا ایک ہے، خدا برحق بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا نہ اس کو کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

یقیناً محدود عقل بشر ذات پروردگار عالم کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے عاجز و قاصر ہے اور ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس وجود کے کنہ ذات کے ادراک سے عاجز ہیں جس کا ہمارے افکار و احساس میں نہ کوئی مثل ہے نہ نظیر۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عمیق ترین نکات فکر، اور معرفت بشری کے عظیم ترین اسلوب متحیر ہو کے رہ گئے ہیں اور لا تھتدی سبیلا کے مصداق بن گئے ہیں۔

یک ذات یگانہ تمام معنی الکلمہ اور ترکیب سے منزہ تمام کمالات کی جامع ہے۔ کیونکہ وجودِ مطلق لامحدود سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں ہے۔ اور اگر اس وجودِ لامحدود سے خارج کوئی کمال ہوتا تو اس ذات کی محدودیت لازم آتی ــــ

جس طرح تمام موجودات کا ایک ذات واجب الوجود تک منتہی ہونا ضروری ہے بایں معنی کہ اس ذات کا وجود از خود ہو کہ کسی غیر سے حاصل نہ ہوا ہو بلکہ وہ ذات عین وجود ہو اور تمام موجودات اپنے وجود میں اسی ذات اور اسی وجود مطلق سے متعلق ہوں ــــ اسی طرح اس کائنات کے اندر جتنے بھی صفات کمال پائے جاتے ہیں مثلاً حیات، قدرت، علم وغیرہ ان کا بھی ایک حیات و قدرت و علم مستقل مطلق کی طرف رجوع ضروری ہے اور ان تمام صفات کا اسی وجود لامحدود کے خصائص سے ہونا ضروری ہے۔

آئیڈیل خدا کے شرائط

یقیناً خداوند متعال ۔ جیسا کہ قرآن نے بھی کہا ہے ۔ معبود کامل مطلق ہے کے تمام صفات کا جامع ہے ۔ وہ حسن و جمال و کمال کا خالق ہے تمام قوتوں اور قدرتوں کا ایجاد کرنے والا ہے ۔ اس کی معرفت ایسا گوہر اور قیمتی جنس ہے جس میں فہم اور عقل معمولی موجود کا اندیچہ بن جاتا ہے ۔ اسی نے زمین و آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے ۔ اگر ایک سکنڈ کے لئے بھی اپنی عنایتوں سے چشم پوشی کرے یا اس کائنات سے صرف نظر کرے تو عالم ہستی نیستی سے بدل جائے اور گرد و غبار بن کر لاپتہ ہو جائے ۔ کائنات کا ہر ذرہ اپنے وجود و ثبات و پائیداری میں اسی پر بھروسہ کرتا ہے ۔

وہ تمام نعمتوں ، سعادتوں کا بخشنے والا ہے ۔ اسی کے ہاتھ میں ہماری پیشانی ہے وہ جب کسی چیز کو خلق کرنا چاہے تو کُن کہہ دے بس وہ چیز ہو جاتی ہے ۔

اسی کی ذات سے حق و حقیقت ہے ، آزادی ، عدالت اور دیگر فضائل و کمالات اسی کے پرتو صفات کا کرشمہ ہیں ۔ اسی کی طرف پرواز اور اس کی بارگاہ ذوالجلال میں تقرب کا مطلب تمام عطا کو ان کے اعلیٰ درجہ میں حاصل کرنا ہے جس نے اس سے لو لگائی اس کو مہربان ، انیس اور پُر محبت دوست پایا ، جس نے اس پر بھروسہ کیا اس نے اپنی امید کی بنیاد ایک محکم و مضبوط پایہ پر رکھی ۔ اس کے غیر سے دل لگانا باطل اور اس کی بنیاد برباد ہے ۔

وہ کائنات ہستی کی جزئی ترین حرکت و جنبش سے باخبر ہے ۔ وہ ہماری خوش بختی کے ذخایر کو معین کر سکتا ہے ۔ وہ انسان کی زندگی اور اس وسیع کائنات میں اس کے روابط کے لئے شریعت ایجاد کر سکتا ہے کیونکہ انسان کے واقعی مصالح سے وہی واقف ہے اور یہ حق صرف پروردگار عالم ہی کو ہے کیونکہ یہ اس کی ربوبیت کا طبعی و منطقی نتیجہ ہے اور صرف الٰہی برنامہ کے مطابق

عمل کرنا ہمارے نفوس کی بلندی کا کفیل ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان حقیقت و عدالت سے اتنی محبت کرے کہ اس کے لئے جان قربان کرنے پر تیار ہو مگر منبع عدل و حق سے اعراض کرے؟

اگر کوئی وجود پرستش کے لائق ہوتا تو سوائے خالق کائنات کے علاوہ — جو محور کائنات ہے — کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی چیز اور نہ کوئی شخص ایسا ہے جو انسان کو اپنا بندہ اور پرستش گر بنائے کیونکہ دیگر تمام ارزشیں نہ تو مطلق ہیں نہ اصیل اور نہ ہی اپنے پر اتکاء رکھتی ہیں بلکہ ان کی ارزش نسبی ہے اور مراتب مافوق کے وسیلہ کا حکم رکھتی ہیں۔

خالق کے لئے عبودیت و بندگی مخصوص ہے اس کی اصلی دلیل یہ ہے کہ اس نے ہم کو نعمتوں سے نوازا ہے اور ہمارے جسموں میں ودیعت کی ہوئی طاقتوں، استعداد اور ہمارے ذخائر و ضروریات و امکانات کا عالم ہے۔ لہٰذا عبودیت صرف اس خدا کے لئے مخصوص ہے جس کی طرف ہر موجود اپنے وجود میں استناد کرتا ہے اور اسی پر اعتماد کرتا ہے۔ اور اسی کی مدد سے کائنات کا قافلہ اسی کی طرف رواں دواں ہے اور اس کا حکم اس کائنات کے نقطہ نقطہ میں نافذ ہے۔

بنا بریں انقیاد و پرستش مطلق بھی اسی ذات اقدس کے لئے مخصوص ہے جو کائنات کے ذرے ذرے کے دل میں موجود ہے۔ اور دوسرے افراد جو ہماری طرح ہیں اور عاجزی و ناتوانی ان کے پورے وجود میں ہے وہ کسی بھی طرح خضوع کے لائق نہیں ہیں۔ اور نہ وہ اس لائق ہیں کہ خدا کے قلمرو میں اپنی زندگی کے اندر غاصبانہ تصرف کریں اور خود انسان اس سے کہیں بزرگ و برتر ہے کہ ان کے سامنے خضوع کرے۔

انسان کو جس وجود کی پرستش کرنی چاہئے وہ خدائے وحدہ لاشریک ہے اور اسی کی قدرت ایسی ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ اپنی ساری کوششوں کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے صرف کر دے اور خدا کے علاوہ کسی بھی محبوب و موجود کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی پر ہرگز مقدم نہ کرے۔ اور اس کا مطلب انسان کی زندگی اور اس کی قدر و منزلت کا قائل ہونا ہے۔ انسان ایک چھوٹا سا قطرہ ہے اگر یہ قطرہ دریا کے ساتھ نہ رہے تو ہمیشہ معرض طوفان میں

اور آفتِ تصنع و فساد کی زد میں رہے گا اور آخر کار خشک ہو جائیگا۔ مگر جب اس منبع فیاض سے مل جائیگا تو ہویت واقعی پائے گا اور جاودانی بن جائیگا۔ اور اس کا فرد اُس کی زندگی کا صحیح معنی ہو جائیگا۔ اور تمام حوادث زندگی کے پس پشت اسی کی ذات ہوگی۔ اور اسی جگہ سے ہمارے لئے عوالم افراد کی وسعت و ضیق کا ان کے اختلاف کے اعتبار سے سمجھنا ممکن ہو جائیگا۔ ہم یا تو فضل و شرف و عدالت اور تمام محترم و مستحسن خصلتوں کو وہمی و خیالی فرض کریں یا بحکم وجدان و فطرت اور ضرورت واقعی ان کو دنیا میں شمار کریں، دونوں صورتوں میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اُس وجود اور کمال مطلق کی حقیقت کے سامنے جو خیر و حیات و قدرت و تمام ارزشوں کا فیضان کرنیوالا ہے، خضوع و سرنگوں ہوں۔

ہم جو غور کرکے دیکھیں تو معلوم ہو جائیگا کہ عالم کے بے شمار موجودات، اور ہماری تمام وہ فطرتیں جنکی جڑیں ہمارے وجود کی گہرائیوں تک پہونچی ہوئی ہیں یہ سب کی سب ایک منبع اور ایک نقطہ تک منتہی ہوتی ہیں اور وہ خدا ہے۔ کہ کائنات کی تمام واقعیت و ماہیت کی اضافت و نسبت اسی کی طرف ہے اور سب کا تعلق اسی سے ہے اور جو وجود اس نقطہ سے شروع ہوتا ہے پھر اسی کی طرف پلٹ کر آتا ہے اور تنہا اُس کی ذات ہے جو لائق عبادت ہے اور جب بندہ اس کو پالے اور اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کو دوست رکھے گا اور اس کے جلال و کمال مطلق کو اس طرح دوست رکھے گا کہ اس کے ماسوا کو بھول جائیگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام موجودات عدم سے وجود میں آئے ہیں اور یہ اپنی مدت بقاء ــــ چاہے وہ مختصر ہو یا لمبی ــ میں خارج کے محتاج رہے ہیں اور ان کے چہرہ پر معلولیت اور عدم استقلال کی مہر لگی ہوئی ہے۔

جس معبود کی ہم کو تلاش ہے کہ مل جائے تو اسکی قربت حاصل کریں اگر وہ ہماری خواہشات و تکالیف سے اور حقائق عالم سے جاہل ہو یا ہماری امیدوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو بلکہ ہماری ہی طرح قاصر و ضعیف ہو تو ہم اُس کو بھلا اپنا ہدف و غایت کیونکر بنا سکتے ہیں؟ اور کمال مطلق سے اُس کی توصیف کیونکر کر سکتے ہیں؟ عبادت اگر کسی حاجت کے پیش نظر ہے تو فطرت

خدا ہی اسکو پورا بھی کرسکتا ہے کوئی دوسرا پوری نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید کا اعلان ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ (اعراف / ۱۹۳)

بے شک وہ لوگ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (بھی) تمہاری طرح خدا کے بندے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ غیر خدا کے سامنے خضوع یا توجہ کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور ہمارے ضمیر و قلب میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی معبود انسان کی عبادت کا مستحق ہوگا اور انسان کو سعادت کی بلند چوٹی تک پہونچا سکتا ہوگا تو وہ ہر نقص و عیب سے پاک ہوگا اور اپنی دائمی شعاعوں سے موجودات کی زندگی کا مدد و معاون ہوگا اور اپنے جمال سے ہر صاحب ضمیر کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہوگا، انسان کی تمام روحی و معنوی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہوگا اور اسکی شناخت کا راستہ پالینا سوائے فطرت انسانی کے منشاء حقیقی تک پہونچے بغیر ناممکن ہے۔

ورنہ اگر ہمارا خدا بعض جہات میں ممتاز ہو اور بعض ضرورتوں کو پوری کرنے پر قادر ہو تو جس وقت ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کرلیں تو ہمارے نزدیک صفت الوہیت سے گر جائیگا۔ کیونکہ اب ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ اور ہمارے توقف کا سبب ہوگا۔ اور نہ صرف یہ کہ ہماری فطرت پرستش انگیز و عبادت خیز کو تشفی نہ دے سکے گا بلکہ ہم کو کسی بھی بلند و برتر کمال کے بارے میں تفکر سے مانع ہوگا۔ اور ہم کو ایک تنگ و محدود دائرہ میں اسیر و مقید کر دے گا۔ اور پھر مدارج علیا کی طرف ترقی کی ہماری خواہش بھی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر ہمارا خدا ہمارے مرتبہ کا ہوا۔ چہ جائیکہ ہم سے پست تر درجہ کا ہو۔ تو ہمارے صلاح کا سبب نہ بن سکے گا اور نہ ہماری ترقی کا وسیلہ ہوسکے گا۔ بلکہ ہم اگر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اور زیادہ قعر مذلت و انحطاط میں پہونچ جائیں گے اور ہماری مثال اس مقناطیسی عنصر کی ہو جائیگی جو اپنے فطری و طبعی رخ سے اعراض کرکے دوسرے اجنبی عنصر کے ضعیف مقناطیسی میں داخل ہو جائے۔ جس کا نتیجہ حیرت و پریشانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور اس وقت ہمارے لئے ہلاکت و بدبختی ایک ایسی ابدی شئی بن جائے گی جس سے کبھی بھی مفر ممکن نہیں ہوگا۔

دعا شاکرین کی بہترین علامت ہے۔

وہ معبود جو انسان کی حرکت کو جہت بخش سکتا ہے۔ اور چلنے والوں کے راستہ میں تاریکی دور کرکے روشنی عطا کرسکتا ہے وہ وہی خدا ہے جو اس بات پر قادر ہے کہ انسانی آرزوؤں کو پورا کرسکے اور جو مدام و ثبوت و تاثیر وجود کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز ہو تا کہ آثار معنوی کا منشاء اور فکر و عمل کا ہادی بن سکے اور انسان کے بہتر تکامل کو آسان بنا سکے۔

انسان کی کوئی بھی سعی یا حرکت جو غلط مقاصد کی طرف ہو وہ انسان کو اس کی شخصیت سے دور کردیتا ہے اور اس کی ماہیت و حقیقت کو مسخ کردیتا ہے۔

اگر انسان خدا کی معرفت سے دور ہو چکا ہے تو اپنا صحیح ادراک نہیں کرسکتا۔ خدا فراموشی کا لازمہ خود فراموشی ہے اور حیات بشر کے مقاصد کلی سے غافل ہونا ہے۔ اور جس دنیا میں وہ پہونچ چکا ہے اس میں رہ کر ہر قسم کے بلند افکار سے غافل ہوجاتا ہے۔

جس طرح غیر خدا سے وابستگی انسان کو اپنے سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور اس کو ایک متحرک مشین بنا دیتی ہے۔ اسی طرح خدا پر بھروسہ کرنا اور اس کی بارگاہ میں رجوع ہونا، غفلت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے، اور حیات معنوی کے فاقد انسان کو اوقیانس غفلت کی گہرائی سے باہر نکال لیتا ہے اور اس کو ہوش میں لاتا ہے اور اس کو اس کی اصلی حالت کی طرف پلٹا دیتا ہے۔ عبادت حق کے سایہ میں روحی صلاحیتیں اور ملکوتی طاقتیں پرورش پاتی ہیں اور انسان اپنی حقیر آرزوؤں اور بے قیمت و محدود مادی امیدوں، اور اپنے اندرونی ضعف و نقائص تک پہونچ جاتا ہے اور ان کی حقیقت سے آشنا ہوجاتا ہے اور اپنے کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ ہے:۔

(مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ عَرَفَ رَبَّهُ) جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔

خدا کا ذکر اور اس کا تقرب دل کو نورانی اور قلب کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ لذت سے بھرپور ہوتا ہے ایسی لذت جس کا قیاس دنیاوی لذتوں سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مختصر یہ کہ ان حقیقت معنویہ مجردہ کی طرف متوجہ ہونے سے افکار میں ترقی ہوتی ہے اور ارزشوں کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔

حضرت علیؑ ذکر خدا کا دلوں میں عجیب اثر ہوتا ہے۔" اسکو بیان فرماتے ہیں: خداوند عالم نے ذکر کو دلوں کی جلاء قرار دیا ہے۔ یاد خدا کے نتیجہ میں دل بہرے ہونے کے بعد سننے لگتے ہیں اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگتے ہیں، طغیان و سرکشی کے بعد نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: خدایا تو اپنے دوستوں کے لئے بہترین انیس، اور تجھ پر بھروسہ کرنیوالوں کے لئے تو سب سے زیادہ مشکل کشا، ان کے باطن کو مشاہدہ کرنیوالا، ان کی ضمیر کی گہرائیوں پر واقف، ان کی میزان بصیرت و معرفت پر مطلع ہے۔ ان کے راز تجھ پر آشکار ہیں، ان کے دل تیرے فراق میں بے تاب ہیں۔ اگر تنہائی ان کے لئے سبب وحشت و اضطراب ہو تو تیری یاد ان کے لئے مونس ہے اور اگر سختی و دشواری ان پر بار ہو تو تو ان کی پناہ گاہ ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۵)

نفسیات کا مشہور عالم ــ ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) لکھتا ہے: انسان کا عبادت کی طرف میلان اس امر کا نتیجہ ہے (اور وہ امر یہ ہے) انسان کا ذاتی شعور اگرچہ ذاتی و عملی اعتبار کے گہرے قسم سے ہو پھر بھی وہ اپنے مصاحب کامل کو دنیائے فکر ہی میں پا سکتا ہے اور زیادہ تر لوگ خواہ متواتر یا اتفاقاً اپنے دل میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح زمین پر حقیر ترین فرد اس توجہ عالی کے ساتھ اپنے کو واقعی اور با ارزش کر لیتا ہے۔[۱]

خدائے بزرگ و برتر کی جو کھٹ پر سب سے اعلیٰ و بلند طریقہ انسان کے شکریہ کا یہ ہے کہ اس کی عبادت کرے اور اس کمال مطلق سے اظہار محبت کرے۔ اور یہ بھی تمام موجودات ہستی سے ہم آہنگی کا ایک طریقہ ہے کیونکہ سب ہی اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:-

---

[۱] اصول فکر دینی ص۱۵۱

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (الاسراء/۴۴)

ساتوں آسمان اور جو لوگ ان میں ہیں (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہان میں) کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے حمد (و ثنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا بردبار بخشنے والا ہے۔

البتہ یہ تقدیس و پرستش خداوند عالم کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں پہونچاتی کیونکہ وہ تو کمال مطلق ہے۔ اس کے یہاں کائنات و انسان کی طرف سے نہ ذرہ برابر کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ اور بھلا یہ کیونکر سوچا جا سکتا ہے کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ اسکی پرستش و تقدیس سے استفادہ کرے گا! البتہ خود انسان حقیقتِ مطلقہ کی معرفت اور پروردگار عالم کی عبادت کر کے اپنے کمال واقعی اور مقصد آخری تک پہونچ سکتا ہے۔

پروفیسر رایمونڈ روایر (PROF. RAYMOND ...) جو فلسفہ کے استاد اور مشہور فیزیاداں تھے وہ کائنات میں وجود شعور کے سلسلہ میں کہتے ہیں: جدید علم کہتا ہے ذرات اور تمام مالیکیول جو کرتے ہیں اس کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اپنے اعمال اور زندگی کی مسلسل حرکت کا شعور رکھتے ہیں اور یہ اپنے اس شعور میں علمائے فیزیا سے زیادہ عالم ہیں کیونکہ علمائے فیزیا ایک ایٹم کے بارے میں جو جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ ایٹم محسوس اور قابل شناسائی نہ ہوتا تو کوئی اس کے بارے میں کیا جانتا؟

جسم، حرکت، سرعت، یہاں، وہاں، شعاعیں، تھاذبی، فضا، فاصلہ یہ سب کے سب ایٹم کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ اور اگر یہ ایٹم نہ ہوتا تو عالم وجود میں ان ظواہر عجیبہ کو کون پیدا کرتا؟ شعور جسم میں وہی تناسب موجود ہے جو حرکت و سکون میں ہے اور جو حرکت کے جہات مثبت و منفی کا ہے۔

لیکن یہ فضا اپنے مجموعے کے اندر اندھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو یہ بات ثابت ہو چکی

ہے کہ مشاہدات میں عنصر اصلی آنکھ ہے لیکن آنکھ محدود قدرت بشری سے محدود ہے اور اس کا تعلق صرف زمین اور زمینی موجودات سے ہے لہٰذا اس کے فیزیاوی عمل کا میدان بھی محدود ہو گیا ہے۔ اس لئے زمین و سورج، سورج و کہکشاں، کہکشاں اور بہت دور پر واقع ہونے والے بڑے بڑے کواکب کے درمیان آنکھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے ایک زمینی عضو کے لئے ـــ مثلاً آنکھ ـ کہاں ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کر سکے ؟

لیکن اسی دلیل سے ہم اس بات کی تصدیق پر قادر نہیں ہیں کہ قدرات عظیمہ اور تبادل قوئی کے میدان میں بھی ولاشعور کا غلبہ ہے ـــ قدرات عظیمہ سے مراد مثلاً وہ کہکشائیں ہیں کہ جن میں فقط جاذبیت و توازن و حرکات و نور و سرعت اور مرکز دائرہ سے دوری کے قوانین ہی حکمرانی کرتے ہیں ان میں بے شعوری و ناآگاہی موجود ہے ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان موجودات عظیمہ میں بھی اور کوئی نہیں ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ وہ ذرات نور جو اپنی حرکت میں ایک پوسٹ مین کا کام انجام دیتے ہیں وہ بھی اپنے اخبار و اشارات کے پہونچانے میں بے سواد نہیں ہیں۔ [1]

---

[1] دو ہزار دانشمند در جستجوی خدائے بزرگ ص ۹۹

صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں

اگرچہ ہم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود خداوند عالم اور اس کی صفات کی معرفت کے لئے کچھ ایسے مفاہیم و اصطلاح کے محتاج ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہے اور جن اصطلاحات کو ہم اسکی توصیف واقعی کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ ہماری مدد کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ خدا کے لامتناہی اوصاف کی کیفیت کو درک کرلینا ہمارے محدود ذہنوں کے بس سے باہر ہے۔ تمام وہ مفاہیم و اصطلاحات جو ذہن بشر کے ساختہ و پرداختہ ہیں ان سے خدا کہیں بلند و برتر ہے۔

انسان چونکہ ایک مخلوق ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہے اس کو اس کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ موجود غیر مادی کو مادی صفات و خصوصیات سے تولا یا بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہماری بحث اس حقیقت کے بارے میں ہے جو طبیعی موجودات و ممکنات کے ماسوی ہے اور جس کی قدرت مطلق اور غیر محدود علم تمام ماسوی اللہ پر محیط ہے اور بہ تعبیر قرآن مجید وہ کسی بھی محدود و ناقص مخلوقات سے مشابہت ہی نہیں رکھتا۔ (شوریٰ / ۹) اور ظاہر ہے کہ ایسا موجود مادی مسائل کے ردیف میں نہیں ہوسکتا۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا کو کسی چیز سے تشبیہ دے یا اس کے مانند قرار دے یا اس کی ذات مقدس کی طرف اشارہ کرے درحقیقت اس نے خدا کا قصد ہی نہیں کیا ہے۔ خدا خالق و آفریدگار ہے اور جو دوسرے پر ٹکی ہو وہ معلول و مخلوق ہے۔ مگر خدا تو علت ہے اور بس!

خدا اسباب و وسیلے کے بغیر خلق کرتا ہے۔ افکار سے مدد حاصل کئے بغیر اندازہ کرتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ وقت و زمانہ اس کے ہمراہ نہیں ہیں۔ آلات و اوزار اس کی مدد نہیں کرتے ہیں۔ اس کی ہستی ہر زمانے سے پہلے ہے۔ اس کی ازلیت ہر آغاز و ابتدا سے مقدم ہے۔ وہ غیر محدود

یہ تو موجودات کی صفت ہے کہ اپنے مخصوص حدود کے اندر اپنی ماہیت کو محدود بنا دیتے ہیں۔ اور یہ اجسام کی خصوصیت ہے کہ ان کے نظائر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی ذات مقدس میں مفہوم حرکت و سکون کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جن چیزوں کو اس نے مخلوقات کے ضمن میں پیدا کیا ہے خود ان کے وجود میں موجود ہوں؟

اگر ذات خدا میں حرکت و سکون کا وجود ہوگا تو اس کی ذات محل تغیر ہو جائے گی اور اس کے وجود کا ازلی ہونا محال ہو جائیگا۔

وہ تمام قوتوں کا منبع ہے لہٰذا کوئی بھی موجود اس میں اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا آفریدگار ہے جو تحول کو قبول نہیں کرتا اور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اور اہل معرفت کی نظروں سے پنہاں نہیں ہو سکتا۔[1]

ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں بحث ایک علمی اور دقیق بحث ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں: جس نے اسے کیفیتوں والا سمجھا اس نے اسے یکتا نہیں سمجھا، جس نے اس کا مثل قرار دیا وہ اس کی حقیقت تک نہیں پہونچا اور جس نے اس کی تشبیہ دی اس نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا، جس نے اس کی طرف اشارہ کیا یا وہم میں لانا چاہا اس نے اس کو بے نیاز نہیں سمجھا، جو اپنی ذات سے پہچانا جائے وہ مصنوع اور جو دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ محتاج ہوتا ہے، وہ آلات کو استعمال کئے بغیر فاعل ہے وہ فکر کو جولان کئے بغیر اندازے مقرر کرنیوالا ہے وہ دوسروں سے استفادہ کئے بغیر غنی ہے، نہ زمانہ اس کا ساتھی ہے اور نہ آلات اس کے مددگار، اس کی ہستی زمانہ سے پیشتر، اس کا وجود عدم سے پہلے، اس کی ازلیت ابتدائے عالم سے سابق ہے۔ چونکہ اس نے شعور کی طاقتیں ایجاد کی ہیں اس سے ثابت ہوا کہ وہ شعور کے آلات نہیں رکھتا اور چونکہ اس نے امور میں ضدیت قرار دی ہے اس سے پتہ چلا کہ اس کی ضد محال ہے۔ اور اس نے چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا اس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے، اس نے نور کو تاریکی کی، روشنی کو اندھیرے کی، خشکی کو تری کی، اور گرمی کو سردی کی ضد قرار دیا۔ وہ ایک دوسرے کی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶

دشمن چیزوں کو باہم جوڑنے والا، متضاد چیزوں کو ملانے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کرنیوالا، اور ملی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کرنیوالا ہے۔ وہ کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ وہ شمار میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ مادی چیزیں ہمیشہ مادی چیزوں کو گھیرا کرتی ہیں۔ اور اپنے جیسوں کی طرف اشارہ کیا کرتی ہیں۔

پروردگار عالم کے صفات اور ہمارے صفات میں جو فرق ہے اور دونوں قیاس کے ناممکن ہونے کی جو وجہ ہے وہ یہ ہے کہ منبع وجود میں جو صفات ہیں ان کے مفاہیم اور موجودات میں جو صفات پائے جاتے ہیں ان کے مفاہیم میں بہت تفاوت ہے۔ مثلاً ہم بعض اعمال پر قادر ہیں لیکن ہماری قدرت ان اعمال پر اس طرح کی ہرگز نہیں ہے جیسی خدا کی قدرت ان پر ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں صفت قدرت اور ہے اور اس کا موصوف اور ہے یا جس وقت ہم اپنے علم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہم اور ہمارا علم دونوں ایک چیز نہیں ہیں کیونکہ زمانہ طفولیت میں ہم تھے مگر ہمارا علم نہیں تھا۔ ہم نے تو بعد میں اس کو رفتہ رفتہ کرکے حاصل کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ علم اور قدرت ہمارے وجود سے الگ چیزیں ہیں اور یہ صفات — علم و قدرت — ہمارے عین ذات نہیں ہیں اور نہ ہمارے وجود سے متحد ہیں بلکہ یہ صفات عارض ہیں اور ہمارا وجود معروض ہے اور دونوں کا حساب الگ الگ ہے۔

لیکن خدا کے یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں خدا عالم ہے یا خدا قادر ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا علم و قدرت کا منبع ہے اور یہاں صفت اور موصوف دو الگ چیزیں نہیں ہے اگرچہ مفہوماً صفت و موصوف متغایر ہیں مگر حقیقتاً صفات خدا عین ذات خدا ہیں۔ اس لئے خدا کو کوئی ایسا معروض نہیں ہے جس پر صفت جاکر عارض ہو بلکہ خدا تو وجود مطلق ہے جو عین علم و قدرت ہے عین حیات و ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ نقص یا غایبی زمانی کی کوئی حد نہیں۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ ہماری تربیت فطرت و طبیعت کے گود میں ہوئی ہے۔ ہم نے اسی عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی ہے اور نظام فطرت سے ہمارا مسلسل انس رہا ہے اور یہاں ہم نے جو بھی چیز دیکھی ہے اس کے مخصوص ابعاد و اشکال میں زمان و مکان ہے اجسام کے خواص ہیں

ان ظواہر فطرت کے مفاہیم سے ہمارے اذہان کے انسیت کی وجہ سے ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کا قیاس اسی پیمانہ سے کریں۔ بلکہ علمی و فلسفی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عقلی و فکری مفاہیم معقولات اول سے ہی سے ناشی ہوتے ہیں۔

اس لئے ایک ایسے وجود کا تصور جس میں مادہ کی کوئی بھی خاصیت نہ ہو بایں معنی کہ ہم اپنے ذہنوں میں جو کچھ بھی سوچیں وہ وجود اس کا غیر ہو۔ اور ایسی ذات کے صفات کا ادراک کرنا جس کے صفات اس سے کبھی کسی بھی طرح جدا نہ ہو سکتے ہوں ۔ علاوہ اس کے کہ یہ خود بہت ہی مشکل امر ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اذہان مکمل طور سے مادی موجودات کے تصور سے بالکل خالی ہوں۔ حضرت علیؑ کا اس سلسلہ میں ایک بہت ہی پر معنی عمیق و دقیق بیان ہے جس میں آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اللہ کی تعریف قیود اوصاف میں کرے جس طرح کہ وہ تصور کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: خدا کی کمال توحید یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف کی غیر ہے۔ جس نے خدا کی صفت بیان کی اور آئی لیکن اس کے لئے صفت زائدہ کا قائل ہو تو) اس نے گویا خدا کا ہمدم و قرین بنا دیا اور جس نے خدا کا قرین و ہمدم بنا دیا اس نے خدا کے اجزاء قرار دیئے اور جس نے اس کے لئے اجزاء قرار دیا وہ خدا سے جاہل ہو گیا۔ (پہلا خطبہ نہج البلاغہ)

ذہنی مفاہیم میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ صفات کے حدود میں خدا کی تعریف کر سکیں یا جس طرح مفہوم اپنے مصداق پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح صفات وجود خدا پر منطبق ہو جائیں یہ ناممکن سی بات ہے۔ کیونکہ تمام صفات و مفاہیم اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے دیگر صفات سے متغائر ہوتے ہیں۔ مثلاً حیات کا مفہوم قدرت کے مفہوم سے بالکل اجنبی ہے اور ایک مفہوم دوسرے پر منطبق نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مخصوص مصداق مل جائے جس میں یہ تمام صفات مستوعب ہوں۔ لیکن اصطلاحی کلمہ تو اپنے مخصوص معنی ہی پر منطبق کیا جائے گا۔

جس وقت انسانی عقل یہ چاہتی ہے کہ کسی چیز کی توصیف کسی صفت سے کرے تو باوجود

اس لئے کہ اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ازلی نا مصداق موصوف وصفت میں ایک قسم کی وحدت نوعی برقرار رکھے ۔ لیکن چونکہ صفت مفہوماً موصوف کے مغایر ہے اس لئے خواستہ و نخواستہ جلالیاً دونوں میں مغایرت کا حکم لگانا ہی پڑتا ہے اور چونکہ اشیاء کے شناخت کا واحد ذریعہ مفاہیم ذہنی سے ان کی توصیف کرنا ہے جو از نظر تصور مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ان اوصاف کا لازمہ محدودیت ہے بنا برایں وہ مفاہیم ذہنی اس حقیقت متعالیہ کی تعریف یا معرفت سے قاصر رہتے ہیں ۔ اور وہ ذات اقدس اس سے کہیں بلند ہے کہ وصف سے اسکو پہچانا جا سکے ۔ اسی لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جو خدا کی تحدید وصف سے کرتا ہے سمجھو کہ اس نے خدا کو پہچانا ہی نہیں :

ایک مثال دیکر کسی حد تک یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ صفات خدا زائد بر ذات نہیں ہیں ۔ آپ سوچئے کہ آگ کا شعلہ ہر چیز کو گرم کر دیتا ہے ۔ یعنی آگ کی کیفیات میں سے ایک کیفیت سوزندگی اور حرارت کا منتشر کرنا ہے ۔ کیا آگ کی یہ خصوصیت شعلے کے کسی خاص حصہ میں مخصوص ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ بلکہ شعلہ جو بھی ہے اس کا پورا وجود یہی خاصیت رکھتا ہے ۔

ایک شخص نے امام ہشتم سے پروردگار کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا :
وہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام اشیاء کے مغایر ہے ۔ وہی تنہا عین حقیقت وجود ہے ۔ وہ نہ جسم رکھتا ہے نہ صورت اور نہ حواس خمسہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ راہ کاوش و جستجو سے اس کو پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ حواس پنجگانہ میں سما سکتا ہے ۔ اوہام و تصورات اس کے ادراک سے عاجز ہیں ، نہ زمانہ و دہر اس میں کوئی کمی نہیں کر سکتے ۔ اور نہ وہ معرض تغیر و تحول میں کبھی ہو سکتا ہے ۔ (اصول کافی ، کتاب توحید ص ۵)

پال کلارنس (PAUL CLARENCE . A) ۔ جو اجتماعی فیزیار کا بہت بڑا عالم تھا وہ کہتا ہے : کتب مقدسہ ۔ توریت و انجیل ۔ میں جب بھی خدا کی تعریف کی جاتی ہے تو انھیں الفاظ سے کی جاتی ہے جو انسان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات

لغات کے تنگی داماں کی وجہ سے ہے۔ ورنہ مفہوم خدا ایک روحی و معنوی مفہوم ہے اور انسان ــــ جس کے افکار مادہ کی چہار دیواری میں محصور و محدود ہیں ــــ کنہ ذات الٰہی تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ اور نہ مفہوم خدا کی کوئی تعبیر بیان کر سکتا ہے۔[1]

اس کے باوجود کہ ہم کسی بھی طرح خدا کی ذات و صفات کے احاطہ پر قدرت نہیں رکھتے ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے امکانات ہم کو جس حد تک بھی اجازت دیں اس کی معرفت کے راستہ میں قدم بڑھائیں۔

---

[1] اثبات وجود خدا ص۶۹

خدا کی یکتائی

جب کبھی مذہبی بحثوں میں توحید کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو اس سے خداوند عالم کی ذات و صفات میں، کائنات پر حکومت اور افعال اور نظام عالم کے ادارہ میں اور دوسری جہتوں میں بھی یکتائی اور وحدانیت کا عقیدہ مراد ہوتا ہے۔

جس طرح توحید ذات میں تعدد کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح توحید صفات میں بھی ترکیب اور ذات و صفات میں اختلاف بھی قطعاً منتفی ہے۔ کیونکہ اختلاف محدودیت کے لوازم میں سے ہے — اور خدا کی ذات اور اس کے صفات غیر محدود ہیں — اور ہم جو ذات خدا اور اس کے صفات میں تفکیک کے قائل ہوتے ہیں وہ محض ہمارے افکار و مطالعات کی وجہ سے ہے ورنہ ذات پروردگار میں تعددجہات و اضافات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا —

اگر ہم کسی چیز کو رنگ برنگ شیشوں کے پیچھے سے دیکھیں تو ہر مرتبہ وہ چیز الگ رنگ میں دکھائی دیگی۔ اسی طرح جب ہم اپنی عقلوں سے ذات پروردگار عالم کی طرف دیکھتے ہیں تو کبھی اس لحاظ سے کہ اس کے سامنے تمام موجودات حاضر ہیں اس وجود لامتناہی کو عالم کہتے ہیں اور جب اس لحاظ سے نظر کرتے ہیں کہ وہ ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے تو اس کو قادر کہہ دیتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم چونکہ اپنے مختلف صفات کو — جو ہمارے محدود وجود کی خاصیت ہے — جب رنگ برنگ دریچوں سے دیکھتے ہیں تو انھیں مفاہیم کو اس ذات نامحدود سے انتزاع کرتے ہیں۔ حالانکہ خارج میں یہ تمام مفاہیم یک وجود رکھتے ہیں اور ایک حقیقت کی خبر دیتے ہیں اور وہ حقیقت وہی ہے جو ہر نقص و عیب سے منزہ ہے۔ اور جو تمام کمالات کی مظہر ہے جیسے قدرت، رحمت، علم، برکت، حکمت، جلال وغیرہ

جب ہم نے یہ جان لیا کہ خدا کا وجود بذاتہ ہے تو اب یہ جاننا چاہئے کہ وجود مطلق تمام جہات سے غیر محدود ہے۔ کیونکہ اگر اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہے تو اس کے وجود کے لئے خارج سے ایک علت کی ضرورت ہوگی جو اس کو موجود کرے۔ کیونکہ وجود خود بخود تو ممکن نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ صرف ایک وجود محض ہے جس کا وجود ذاتی ہے۔ اور چونکہ ذات عین وجود ہے لہٰذا وہ علم، قدرت، ازلیت، ابدیت کے لحاظ سے غیر محدود ہوگا۔ اس لئے کہ علم و قدرت بھی ایک قسم کے وجود ہیں۔ اور جو ذات عین وجود ہوا کرتی ہے اس کے لئے یہ سارے کمالات بطور غیر محدود ثابت ہوا کرتے ہیں۔

•

خدا کی یکتائی اس کے واضح صفات میں سے ہے۔ تمام آسمانی ادیان نے اپنی اصلی اور غیر تحریف شدہ تعلیمات میں بشریت کو خالص توحید — جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو — کی طرف دعوت دی ہے۔ کیونکہ شرک اپنے تمام صور و انواع کے ساتھ بشر کے لئے سب سے زیادہ ضرر رساں گمراہی ہے۔ جو طول تاریخ میں جہالت و ناآگاہی اور عقل کی رہنمائی سے انحراف اور انبیاء کے مکتب توحیدی سے اعراض کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اگر لوگ فکر صحیح اور دلائل عقلی و انبیاء کی راہ نمائی کی پیروی کر کے خدا پر ایمان لاتے تو کسی بھی موجود و مصنوع غیر خدا کو خدا کی جگہ قبول نہ کرتے۔ اور نہ کوئی دوسرا موجود خدا کی تدبیر و تقدیر و امر کے ساتھ شریک ہو سکتا۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد ہے تو اس سے جسمیت مراد نہیں ہوتی کیونکہ جسم تو کئی ظروف اور اجزاء سے مرکب ہوا کرتا ہے اور ہم تو اللہ سے ترکیب، تجزیہ، تو الد کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں ممکن کے صفات ہیں۔ اور ہر وہ مرکب جو ترکیب سے پیدا ہوا ہو وہ نہ خدا ہو سکتا ہے نہ شبیہ خدا۔

خدا کے لئے متعدد مصادیق کا تصور اس وقت ممکن ہوتا۔ جب اس پر کمیت، کیفیت،

زمان، مکان جیسے صفات کا صدق ممکن ہوتا ۔ اور خدا ان اوصاف و قیود میں سے کسی سے بھی متصف نہیں ہے لہٰذا فطری طور پر اس کے لئے کسی مشابہ یا مثل کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

اگر کسی قید کے بغیر حقیقت آب کا تصور کریں اور کئی مرتبہ اسی تصور کو دہرائیں تو پہلے تصور پر کوئی چیز زیادہ نہیں ہوگی ۔ کیونکہ ابتداہی میں پانی کا تصور بطور مطلق کسی بھی قسم کی قید و شرط و کمیت و کیفیت کے بغیر کیا تھا ۔ دوسرے اور تیسرے تصورات میں حقیقت آب کی دو فردوں کا فرض کرنا ناممکن ہے ۔

لیکن اگر حقیقت آب سے خارج قیود کا اضافہ کردیں تو اس کے بہت سے افراد ہو جائیں گے اور موارد و منابع کی تعداد کے لحاظ سے افراد آب بھی متعدد ہو جائیں گے ۔ مثلاً بارش کا پانی، چشمہ کا پانی، نہر کا پانی، سمندر کا پانی، مختلف زمانوں اور مکانوں میں یہاں اور وہاں کی قید سے افراد بڑھتے ہی جائیں گے لیکن جب قیود کو حذف کردیں اور صرف اصل حقیقت آب کو ملحوظ رکھیں تو اس میں تعدد ناممکن ہو جائے گا اور صرف ایک ہی حقیقت رہ جائے گی ۔

یہی طرح یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جو موجود کسی مکان میں ہوگا وہ خود بخود مکان کا محتاج ہوگا ۔ اور مکان کے اندر رہنے والا موجود اپنے وجود میں ظرف زمان و مکان کا جو اس کے مناسب حال ہو بہرحال گرویدہ ہوگا ۔ اور صرف اسی زمانہ میں اس کا وجود پایا جائے گا جو مخصوص ان شروط پر مشتمل ہو ۔ لیکن اگر ہم کو ایسا موجود ملے جس سے کوئی زمانہ کوئی مکان خالی نہ ہو اور بلند ترین صفات کمالات سے متصف ہو اور وہ کامل مطلق ہو اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز کامل مطلق ہو اور نہ کوئی دوسری ذات اس کے علاوہ نقص و عیب سے منزہ ہو تو ایسی صورت میں ایسی حقیقت متعالیہ کے لئے دوگانگی کا تصور اس کے عین متناہی ہونے اور محدود ہونے کا تصور ہے ۔

بنیادی اور اصولی طور پر خدا واحد بالعدد نہیں ہے کہ اس کے لئے اسی کی سنخ سے فرد دوم کا تصور کیا جا سکے بلکہ اس کی یکتائی اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے ساتھ دوسری فرد کا وجود فرض

کیا جائے تو وہ عین فرد اول ہو۔

چونکہ تعدد اشیاء کے لئے ایسے قیود کا ہونا ضروری ہے جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز و ممتاز بنا دیں۔ اس لئے اگر ایسا موجود فرض کیا جائے جو ہر قید و شرط سے آزاد ہو تو دوسرے فرد کا فرض کرنا قطعاً غیر معقول ہوگا کیونکہ فرد ثانی کا وجود مستلزم ہوگا کہ اس کے لئے حدود ممیزہ مانے جائیں اور اگر یہ کہا جائے کہ دوسرے فرد میں تمام حدود منتفی ہیں تو پھر وہ دو موجود نہ ہوئے بلکہ دوسرے فرد کا تصور وہی فرد اول کے تصور کی تکرار ہوگا۔

خدا کی یکتائی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم تنہا خدا کا تصور تمام موجودات سے قطع نظر کر کے کریں۔ اگرچہ یہ فرض بعید ہو۔ تو بغیر کسی شریک یا مثل یا ولد یا کفو کے اس کا وجود ثابت و برقرار رہے۔ اسی طرح اگر ہم خدا کا تصور تمام موجودات کے ساتھ کریں جب بھی اس کا وجود بلا شریک ثابت و برقرار رہے۔ لیکن اگر ہم تمام موجودات کا تصور وجود خدا کے بغیر کریں تو ان موجودات کی بقا ممکن نہ رہے کیونکہ موجودات کے وجود کا حدوثاً و بقاءً دار و مدار خدا کے وجود پر ہے۔ جب خدا ہی نہ ہوگا تو یہ موجودات کیونکر ہو سکتے ہیں؟

اس بنا پر اگر خدا کے لئے کسی قید و شرط کو مان لیں تو جب بھی یہ قید یا شرط منتفی ہوگی خدا کا وجود بھی منتفی ہو جائیگا۔ کیونکہ اذا فات الشرط فات المشروط۔ لہذا وجود خدا مطلق ہے اور غیر مشروط اس کے ساتھ تعدد کا فرض کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے عقل اس کی منبع سے فرد دوم کو فرض ہی نہیں کر سکتی۔ اس بات کو ہم ایک مثال دیکر سمجھائیں مثلاً اگر ہم فرض کریں کہ اس عالم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی انتہا ہے اور اگر ہم اس کے کسی طرف بھی چلنا شروع کریں تو نقطہ انتہا پر نہیں پہونچ سکیں گے تو اب اس طرح کا عالم مان لینے کے بعد کیا ہم اس کے ساتھ دوسرا عالم فرض کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ جب ہم نے پہلے ایک غیر محدود عالم فرض کر لیا تو وہ خود ہی ذاتی طور سے اس بات کا مانع ہوگا کہ اس کے ساتھ دوسرا عالم فرض کیا جائے کیونکہ جس چیز کو ہم دوسرا عالم فرض کریں گے وہ یا تو یہی عالم ہوگا

یا اس عالم کا جزء ہوگا۔

لہٰذا جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ خدا وجود محض ہے تو اب اس کے ساتھ اسی جیسا دوسرا خدا ماننا ایسے ہی ہے کہ ہم لامحدود عالم مان کر اس کے ساتھ ایک دوسرا جسمانی عالم مان لیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن بات ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ واحد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرا خدا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا خدا فرض کرنا بھی ناممکن ہے۔ اور نفس وجود خدا اس کے واحد اور فرد ہونے کا مستلزم ہے۔ اور یہ کہ وہ بذاتہ منفرد ہے۔ اس طرح وہ دیگر موجودات سے ممیز ہو جاتا ہے جبکہ دیگر موجودات بذات خود متمیز نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا نے جو اسباب تمیز و تشخیص بخشے ہیں ان کے ذریعہ وہ متمیز ہوتے ہیں۔

اگر کلمہ (اللہ) کا صحیح اور واقعی معنی انسان عاقل کے ذہن میں متحقق ہو جائے اور انسان صحیح معنی سے معرفت حاصل کرے تو وہ خود ہی فطری طور پر سمجھ لے گا کہ ذات خدا کے ساتھ تعدد ماننا قطعی طور سے ناممکن ہے۔

●

ہم بڑی وضاحت کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک نظام واحد مستمر تمام اجزائے عالم میں کارفرما ہے۔ انسان گیاہ و نباتات کے لئے ہمیشہ کاربن گیس تولید کرتا رہتا ہے اور درخت و نباتات انسان کی تنفس کے لئے آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں اور انسان و نباتات کے اس داد و ستد کے نتیجہ میں ایک معین مقدار آکسیجن کی محفوظ رہتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو جائے تو کرہ زمین پر انسان کا نام و نشان نہ ملے۔

زمین سورج سے جتنی حرارت حاصل کرتی ہے اس کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ زندہ موجودات کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ سورج کے گرد زمین کی سرعت رفتار اور عظیم منبع طاقت و حرارت یعنی سورج سے زمین کا فاصلہ اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ زمین پر انسان کی زندگی ممکن ہو سکے۔

مثلاً اگر زمین کی سرعت رفتار ہزار میل فی گھنٹہ سے گھٹ کر سو میل ہو جائے تو موجودہ دن رات دس گنا بڑھ جائیں گے اور گرمی کے زمانہ میں درجہ حرارت اتنا بڑھ جائے کہ تمام نباتات جل جائیں اور سردی کے زمانہ میں راتوں کی ٹھنڈک اتنی زیادہ ہو جائے کہ تمام قسم کے گیاہ اور پھول منجمد ہو کر رہ جائیں۔

اور اگر سورج کی گرمی جتنی اس وقت ہے اس سے گھٹ کر آدھی رہ جائے تو سردی کے زمانہ میں تمام جاندار جم جائیں اور کسی بھی حرکت پر قادر نہ ہو سکیں اور اگر سورج کی گرمی موجودہ وقت سے دوگنے سے زیادہ ہو جائے تو نطفۂ حیات مرحلۂ تکوین ہی میں متوقف ہو جائے۔

اسی طرح اگر چاند کی زمین سے دوری بہت زیادہ ہو جائے تو سمندروں کے پانی کا جزر و مد اتنا بڑھ جائے کہ سمندر کی موجیں پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

یہ کائنات کچھ اس طرح خلق کی گئی ہے کہ گویا یہ ایک کاروان ہے جس کے تمام رہرو حلقۂ زنجیر کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں اور یہ سب ایک نظام واحد کے چھوٹے بڑے اجزاء کی طرح ایک جہت میں سعی و فعالیت میں مشغول ہیں اور اس نظام کے ہر ہر جزء کی اپنی ایک تکلیف اور ایک وظیفہ ہے اور یہ پورا نظام ایک دوسرے کی مدد کر کے ایک دوسرے کے تکمیل کا سبب بھی ہے اور اس کے تمام ذرات کے درمیان ایک عمیق و معنوی علاقہ موجود ہے۔

مشہور مفکر رو آیہ   کہتے ہیں: اس کائنات کے تمام مخلوقات میں ایک زنجیر یا تاگے سے بندھا ہوا مستحکم رشتہ ہے جو ان کے درمیان بھرپور توازن کو قائم رکھے ہے۔ یہاں تک کہ بے شعور و بے وجدان مخلوقات بھی اس مخصوص رشتہ کے فیوض و برکات سے محروم نہیں ہیں۔ اور اس کائنات کی مخلوقات گویا ایک مرتب و مسلسل لامتناہی قطار میں ہیں اور یا پھر یہ ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں جو نہ ٹوٹنے والے ہیں۔ اور اس مخلوقات کی حرکات حیات اسی نامرئی اور قوی علاقہ کے طفیل میں ثابت و برقرار ہے۔

ذرا ایک زندہ آدمی کو دیکھئے اس کی گردش خون، گردش لنف[١]، ہارمونی و عصبی حرکات

---

[١] شدید ہی انسان میں ایک سیاہ رنگ کا سیال لاجیرہ ہے۔

نہاد آدمی میں اتنی زیادہ ہم آہنگ وہ وابستہ و پیوستہ ہیں اور اتنی وسعت و قدرت کے ساتھ دائماً طے پر ہیں کہ پہلی مرتبہ دیکھنے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ ایک ہرج و مرج سے بھرپور بے ترتیب نظام کے طوفان میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جنبۂ فیزیولوجی سے قطع نظر کر کے ہر زندہ خلیہ کی عام شکل بصورت حلقہ ہائے زنجیر ہے، یا ان یا ہرج و مرج عظیم دو وحشتناک طوفانوں کے درمیان ایک دوسری طویل صف اتب و تاب کی تلاش میں ہے۔ اور انسانی فکر اس وقت مبہوت ہو جاتی ہے اور انگشت بدنداں رہ جاتی ہے جب یہ دیکھتی ہے کہ تمام یہ زیر و بم، طوفان، تعامل، باہم یکجگی ایک عظیم وحدت بخش عامل کے زیر ہدایت کام کر رہے ہیں۔ اور اس عامل قدیر کو ہر وحدت و نظام میں "جو بظاہر غیر منظم مجموعہ ہے" دیکھا جا سکتا ہے۔[1]

اسی بنا پر ہم کہتے ہیں جو کائنات ایک وحدت سے سرشار ہے اس کو ایک حقیقت اور ایک مبدء سے وابستہ ہونا چاہئے اور اس کائنات کا وجود اسی ایک نقطہ وجودیہ اور مبداء واحد سے ہونا چاہئے۔ اگر وجود ایک ہو تو اس کا موجد بھی ایک ہی ہو سکتا ہے جس خدا نے مختلف و متکاثر وجود میں ایک وحدت و نظم کو پیدا کیا ہے اس نے اپنی اس قدرت کا مظاہرہ کر کے اپنی وحدانیت اور علم و قدرت پر ایک واضح دلیل پیش کر دی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ؟ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ. بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا. إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا. وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ. إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا. (فاطر/۳۹ - ۴۰)

---

[1] دو ہزار دانشمند در جستجوئے خدائے بزرگ ص۵

(اے رسولؐ !) تم ان سے پوچھو تو خدا کے سوا اپنے جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے انھیں (کچھ) دیکھا بھی ۔ مجھے بھی ذرا دکھاؤ تو کہ انھوں نے زمین (کی چیزوں) سے کون سی چیز پیدا کی یا آسمانوں میں کچھ ان کا آدھا ساجھا ہے یا ہم نے خود انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اسکی دلیل رکھتے ہیں (یہ سب تو کچھ نہیں) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے (دھوکے اور) فریب ہی کا وعدہ کرتے ہیں، بیشک خدا ہی سارے آسمان و زمین کو اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر (فرض کرو کہ) یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر اس کے سوا کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔ بیشک وہ بڑا بردبار (اور) بڑا بخشنے والا ہے ۔

خود ہماری فطرت بھی اس یگانگی کی تائید کرتی ہے ۔ کیونکہ جب ہم سخت بحران، اور جان فرسا گرفتاریوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو (فطری طور پر) ہماری امیدیں ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہوتی ہیں اور ایک ہی نقطہ کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اسی سے دلبستگی پیدا کرتی ہیں ۔

امام جعفر صادقؑ کے ایک شاگرد[1] نے حضرت سے پوچھا خدا کی یکتائی پر کیا دلیل ہے ؟ فرمایا: جہاں آفرینش کا دوام و استمرار اور باہم پیوستگی اور نظام ہستی کا مکمل ہونا ۔ جیسا کہ ارشاد خدا ہے : ۔ لو کان فیہما آلـہۃ إلّا اللہ لفسدتا ۔ (کتاب الصدوق ۔ باب التوحید) پس اس نظام عالم کا استقرار و شمول تعدد الٰہۃ کے مفروضہ کے بطلان کے لئے کافی ہے ۔

مسٹر موریس میٹرنگ (MORIS METERING) کہتے ہیں : جس وقت تمام اجسام کے ذرات کو شگافتہ کیا جائے تو ایک ایٹم تک رسائی ہوگی اور جب ایٹم کو شگافتہ کیا جائے تو ہماری رسائی ایک ایسی چیز کی طرف ہوگی جس کو ہم مجبوری بجلی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی وہ

---

[1] ہشام بن الحکم

چیزیں جو تمام شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور تمام دنیا کے مصالح کا مدار اسی پر ہے۔ اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے دو ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیزیں خواہ وہ مواد ہوں یا قوانین ایک ایسی چیز سے وجود میں آئی ہیں جس کو ابھی تک ہم نہیں جانتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ خلقت و ارادہ عالم کے سلسلہ میں قرآن خدا کی یکتائی کی تاکید کرتا ہے پھر بھی ان اسباب وعلل کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو اس کے فرماں بردار ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَاللّٰهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ۔ (نحل/٦٥)

اور خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا تو اس کے ذریعہ زمین کو مردہ (بنجر) ہونے کے بعد زندہ (شاداب) کیا، کچھ شک نہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں (قدرت خدا کی) بہت بڑی نشانی ہے۔

اور جب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ: اس کارگاہ ہستی میں خدا کے علاوہ کوئی خالق ومدبر ومربی نہیں ہے اور کائنات کے تمام منابع تاثیر اسی کے امر وارادہ کے تابع ہیں۔ اور ہر نقش کا ایجاد کسی بھی عامل کی طرف سے ہو یا کائنات کی ہر علت وسبب اسی ذات واحد ولاشریک کی طرف سے اس کے سپرد ہے۔ پھر خدائے یکتا کے ساتھ دوسرا خدا کیونکر مانا جا سکتا ہے؟ اور کس طرح دوسرے کی عبادت کی جا سکتی ہے؟ قرآن اسی چیز کو بیان کرتا ہے:- وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (فصلت[1])

اور اسی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں (تو) تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرنا اور نہ چاند کو اور اگر تم کو خدا ہی کی عبادت کرنی منظور ہے تو بس اسی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

---

[1] [illegible] اس کو حم السجدہ بھی کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس سے پہلے والے سورہ مومن کو سورہ غافر بھی کہتے ہیں۔

خدا کی غیر محدود قدرت

فطرت کے ظواہر اور ان کے الوان و اشکال —— جو بیان سے باہر ہیں —— کے مطالعہ سے واضح و روشن تر دلیل خداوند عالم کے غیر متناہی قدرت پر نہیں ملے گی۔

جب ہم مخلوقات خدا پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنے وجود کو خدا کی اس عظیم قدرت کے سامنے دیکھتے ہیں جس کے حدود و قیود کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان مخلوقات کا مطالعہ اور ملیونوں وہ حقائق جو ان میں اور ہمارے نفوس میں قدرت نے ودیعت کئے ہیں وہ ہم کو ایسے براہین تک پہونچاتے ہیں جن سے خالق کی لامتناہی قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس نظام کی تفسیر و تعلیل خدا کی قدرت مطلقہ کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔

خدا کی قدرت لامتناہی ہی وہ چیز ہے جو عقل کو اس عظیم نظام کے خالق کے سامنے سرنگوں ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہمارے پاس کوئی ایسا کمرہ نہیں ہے جو اس عظیم لامتناہی قدرت کے ابعاد مشخص کر سکے۔ خدا کی قدرت تو یہ ہے کہ جس کی طرف اسنے خود اشارہ کیا ہے۔ انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (یٰسین/۸۲)

علوم طبیعت کے بڑے بڑے جغادری اور تحقیقات علمیہ کے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان آج تک اس چھوٹی بڑی مختلف مخلوقات کی اس کثرت کے باوجود بطور کامل ایک جزء کی بھی حقیقت کا انکشاف نہیں کر پائے —— لیکن پھر بھی اس عالم کے موجود نظام کے بنسبت یہ تھوڑے اور ناقص و مختصر معلومات اس بات کے لئے بہرحال کافی ہیں کہ جن سے اس کی عظیم لامتناہی قدرت کا ادراک کیا جا سکے —— یعنی یہ تمام گوناگون مخلوقات جن کے حجم بھی الگ الگ ہیں۔ اور دنیا کے سمندروں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے جانور اپنے حیرت انگیز قیافوں

کے ساتھ، اور رنگ برنگ خوشنما بال و پر والے اور خوش الحان پرندے جو فضا میں اپنے بال کھولا دیتے ہیں، جنگلوں کے وسط میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر چابک دست ہنرمند حضرات ان پرندوں کے خوبصورتی کی تھوڑی بہت تقلید اپنے فن پاروں میں کردیں تو ان کے ہنر کا بازار گرم ہوجائے اور یہ نجوم و کواکب، سورج کا طلوع و غروب، شفق و افق، شمس و قمر، کرات و کہکشائیں اور وہ بادل جن میں بعید ترین عظیم چمکدار نجوم ہیں، یہ چیزیں صاحبان عقل کو متحیر کردیتی ہیں۔ کیا یہ چیزیں اس کی لامتناہی قدرت پر دلالت نہیں کرتی ہیں؟

پروفیسر رودابیہ —— عالم فضا کے ایک گوشے کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہمارے اس نظام شمسی میں ایک لاکھ ستارے موجود ہیں اور اب تک ان میں سے صرف پانچ ہزار پہچانے جاسکے ہیں۔ اور ہمارا یہ پورا نظام شمسی ہماری کہکشاں کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جز ہے اور ہم صرف اس کہکشاں کے چھوٹے سے حصے ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ حصہ بہت ہی کثیف و متراکم ترین ہے۔

اور یہ عظیم کہکشاں دوسری میلیارد[1] کہکشاؤں کے مقابلہ میں صرف ایک ایسا مختصر سا بادل ہے جس میں ستارے ہوں۔ اور ان تمام کہکشاؤں کا مجموعہ علمی لحاظ سے (متا کالاکسی[2]) کہا جاتا ہے جو ہماری دنیا کو تشکیل دیتا ہے۔

آئنسٹائن (EINSTEIN) بے مثال دانشمند اور نظریہ اضافت کے بابا آدم نے اس کائنات کی اضافی شعاعوں کا حساب چھ سو ملیارد نوری[3] سال کیا ہے۔ اور علماء کو اپنے اس نظریہ پر قانع کردیا تھا کہ عالم اپنے اصلی حد میں بے انتہا ہے اور ہمارے آج کے دور کے

۱؎ ایک ہزار ملیون کا ایک میلیارد ہوتا ہے۔ یہ ملیارد کی جمع ہے

۲؎ META GALAXY

۳؎ اس سے مراد یہ ہے کہ نور ایک سال میں جتنی مسافت طے کرتا ہے۔ نور کی رفتار ایک سیکنڈ میں ۱۸۶ ہزار میل ہوتی ہے۔

علمی وسائل و امکانات اس عالم کی انتہا کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ اس لئے اب بہتر صورت یہی ہے کہ اس عالم کی اضافی شعاعوں کو چھ سو ملیارد نوری سال مان لیا جائے جو لانہایت کے مساوی ہے اور اس کے بعد اس اضافی فضا کی تحقیق شروع کریں جس کا قطر دو ہزار دو سو ملیارد نوری سال ہے۔

آئنسٹائن (ALBERT EINSTEIN) نے یہ حساب اور یہ علمی تحقیقات ان فضائی رصدگاہوں کے سہارے بیان کئے ہیں جو فضائی تحقیقات کے لئے عالم کی گہرائیوں تک جاتی تھیں جیسے رصدگاہ پالومار[1] جو کہ سب سے زیادہ طاقتور رصدگاہ سمجھی جاتی تھی اور آج بھی شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو نے اس سرحد کو توڑا ہے۔ یعنی رصدگاہ پالومار کی اہمیت کم کر دی ہے۔

فضائی کیمروں کے ذریعہ اتاری گئی اصلی رنگوں سے رنگین کافی سے زیادہ تصویریں جن کو رصدگاہ (پالومار) نے کھینچا تھا اور خصوصاً ہمارے کہکشاں کی تصویریں بہت دنوں تک عالم میں علمائے فضا کے لئے محل تحقیق رہی ہیں اور علمائے فضا نے جن نظریات کا اظہار کیا تھا وہ انھیں تصویروں کی بنا پر تھے۔

ہماری اس کہکشاں کا طول ایک لاکھ نوری سال ہے اور ہمارا نظام شمسی اس کے ایک کونے میں ہے اور یہ کہکشاں فضا میں ملیارات[2] سال سے دو سو پچاس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔[3]

پس کیا یہ کائنات اپنی اس محیر العقول عظمت کے ساتھ خدائے بزرگ کی قدرت مطلقہ پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس خالق کی قدرت سے چشم پوشی کر لیں؟ جس نے

---

[1] یہ شمسی رصدگاہ ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی اور اس کا نام (PALOMAR MOUNT OBSERVATORY) رکھا گیا پھر ۱۹۶۹ء میں اس کا نام (HALE OBSERVATORIES) رکھا گیا۔ اور ۱۹۷۵ء تک اس میں دنیا کی سب سے بڑی دوربین نصب تھی۔

[2] ملیارد کی جمع

[3] دو ہزار دانشمند در جستجوئے خدائے بزرگ ص ۳۲-۲۹-۱۳۔

ان متنوع اور مختلف الوان کو حیات بخشی ہے اور جس نے ان کے لئے اصول حیات بخشے ہیں اور ان کو صورت و شکل عطا کی ہے اور ان کے حدود معین کئے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے کہ یہ دل فریب موجودات کی خلقت ایٹم سے ہوئی ہے۔ اور ان موجودات کی تفسیر بغیر ایک لامتناہی قدرت "جو بااراده و باقدرت و ہدایت کرنیوالی ہے" کے مانے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جو قادر علی الخلق والابداع ہے اور جو مھندس و حکیم ہے۔

چھوٹا، بڑا، مشکل اور آسان مسئلہ موجودات محدودہ کے خواص میں سے ہے۔ لیکن خدا کے یہاں کم و زیادہ، چھوٹے و بڑے کا مسئلہ نہیں ہے، عاجزی و ناتوانی کہ جو فاعل کی محدود طاقت کا معلول ہوتی ہے اور یا وجود مانع اور یا کمی وسائل کی معلول ہوا کرتی ہے اس کا خدا کے بارے میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کہتا ہے :۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (فاطر/۴۴)

اور خدا ایسا (گیا گذرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے (نہ تو) آسمانوں میں اور نہ زمین میں، بے شک وہ بڑا خبردار اور بڑی قدرت والا ہے۔

اور باوجود اس کے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن دنیا کو اس نے ایک مخصوص و مشخص نظام کے پیش نظر خلق کیا ہے۔ اور اس نظام دقیق کے چوکھٹے میں ہر شی کے لئے ایک معین دائرہ بنا دیا ہے اور ساری چیزیں اس کے احکام کی فرمانبردار ہیں۔ معمولی سی عدول حکمی نہیں کر سکتیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے :۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۔ (الاعراف/۵۴)

اور اس نے آفتاب و ماہتاب و ستاروں کو پیدا کیا یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابعدار

ہیں ۔ دیکھو حکومت اور پیدا کرنا خاص اسی کے لئے ہے وہ خدا جو سارے جہان کا پروردگار ہے بڑا برکت والا ہے ۔

نظام ہستی کا کوئی موجود تنہا نہ مظہر قدرت ہو سکتا ہے اور نہ اپنے ارادہ و حکم میں مستقل ہو سکتا ہے ۔ اور خدا کا جس طرح ذات میں کوئی شریک نہیں ہے ۔ اسی طرح فاعلیت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے ۔ اور جس طرح موجودات جہان اپنی ذات میں مستقل نہیں ہیں بلکہ خدا سے وابستہ ہیں ۔ اسی طرح فاعلیت و تاثیر میں بھی مستقل نہیں ہیں ۔ ہر عامل و سبب اپنے وجود کی حقیقت کو خدا سے حاصل کرتا ہے اور اپنی فاعلیت و تاثیر کو بھی اسی سے حاصل کرتا ہے ۔

اگر مشیت الٰہی کا تقاضا ہو اور وہ اس نظام ہستی کو ختم کرنا چاہے تو یہی طاقتور نظام اس کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہو جائیگا ۔ کیونکہ جس خالق نے اسباب و علل کو خاص اثر بخشا ہے وہ ہر وقت اس بات پر قادر ہے کہ جس وقت چاہے ان کے اثر کو ختم کر دے ۔ اور جس طرح ایک حکم سے موجودات کو پیدا کیا تھا دوسرے حکم سے ان کی تاثیر کو ختم بھی کر سکتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي
بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ
الْأَخْسَرِينَ ـ (انبیاء ــــ ۶۸، ۶۹)

(آخر) وہ لوگ (باہم) کہنے لگے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو (غرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تو) ہم نے فرمایا اے آگ تو ابراہیم پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا (کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہونچے) اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال بازی کرنی چاہی تھی تو ہم نے ان سب کو ناکام کر دیا ۔

سورج اور زمین کی قوت جاذبہ اگرچہ اس دنیا کے بہت بڑے میدان میں اپنا نفوذ رکھتی ہے

مگر خدا کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہے۔ جہاں خدا نے کسی چھوٹے سے پرندہ میں بھی طاقت بخشی تو وہ زمین کی قوت جاذبہ کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ فضا میں اڑنے لگتا ہے۔ اسی کو قرآن کہتا ہے:-

اَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (النحل ۷۹)

کیا ان لوگوں نے پرندوں کی طرف غور نہیں کیا جو آسمانوں کے نیچے ہوا میں گھرے ہوئے (اڑتے رہتے) ہیں۔ ان کو تو بس خدا ہی (گرنے سے) روکتا ہے۔ بے شک اس میں بھی (قدرت خدا کی) ایماندروں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس نظام کے اندر جو موجود بھی فرض کیا جائے اس کے وجود و دوام حیات کی ضرورتیں صرف خدا ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں اور اس نظام میں جس قدرت کا بھی وجود فرض کیا جائے آخرکار خدا کی لا انتہا ہی قدرت کی طرف اسی کی بازگشت ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۵۹ میں فرماتے ہیں: ہم تیری کنہ عظمت کو نہیں پہچان سکتے بس ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تو حی و قیوم ہے نہ تجھ کو نیند آتی ہے نہ اونگھ، کوئی نظر و فکر تجھ تک پہونچ نہیں سکتی نہ کوئی آنکھ تجھ کو دیکھ سکتی ہے تو نے ابصار کا ادراک کیا ہے۔ اعمال کا احصا کیا ہے اور نواصی واقدام سے گرفت کی ہے، باوجودیکہ ہم نے تیری آفرینش کی کسی چیز کا ادراک نہیں کیا ہے مگر تیری قدرت پر متعجب ہیں تیری عظیم عظمتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ جو چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں ہماری آنکھیں ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اور ہمارے خرد و فکر کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے اور ان چیزوں کے درمیان جو غیبی پردے پڑے ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔

انسان جب کسی چیز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے مثلاً اسپتال بنانا چاہتا ہے تو وہ کچھ ایسے وسائل و آلات کو مہیا کرتا ہے جن کے درمیان کوئی ذاتی علاقہ نہیں ہوتا صرف اس میں سب کے کارآمد ہونے کا رشتہ ہوتا ہے اور یہ سب اس لئے کرتا ہے کہ حصول مقصد میں کامیابی ہو۔

اور ان ضروری — وکارآمد ہونے والی چیزوں — کے ایجاد کے لیے مختلف چیزوں اور طاقتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل — جو اس نظام کی ایک جزئی چیز ہے — فاعلیت ایجادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حرکت کی فاعلیت ہے جو اشیاء موجودہ کو ایک مخصوص شکل کی صورت میں کردے گی۔ اس کے برخلاف خدائی مصنوعات کہ ان میں چند بکھری چیزوں کو اکٹھا کر کے ان کو ایک مخصوص صورت دینا نہیں ہے۔ بلکہ خدا تمام چیزوں کو ان کی خصوصیات و قوتوں کے ساتھ خلق کرنے والا ہے۔

یاد رکھئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ "خدا ہر چیز پر قادر ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کا تعلق صرف ممکن امور سے ہوا کرتا ہے لیکن محالات عقلیہ اس کے دائرہ قدرت سے بالکلیہ خارج ہیں۔ بلکہ محالات میں لفظ قدرت کا استعمال ہی بے معنی ہے — یہ درست ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ محل میں قدرت الٰہی قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ کسی بھی چیز سے قدرت خدا کا تعلق اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ شی محال عقلی نہ ہو اور ذاتی صلاحیت قبول قدرت کی رکھتی ہو — یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ فیض الٰہی دائم ہے اس کی کوئی انتہا نہیں ہے لیکن اس مورد — محال عقلی — میں اس فیض کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے — سمندر میں پانی بہت ہے لیکن آپکے پاس جتنا بڑا ظرف ہوگا اتنا ہی تو پانی لے سکتے ہیں؟ کوئی بھی ظرف اپنی صلاحیت سے زیادہ پانی نہیں لے سکتا۔ یعنی محدودیت ظرف کی طرف سے ہے سمندر کی طرف سے نہیں ہے۔

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کیا خدا اس بات پر قادر ہے کہ پوری دنیا ایک انڈے میں سمو دے مگر نہ دنیا چھوٹی ہو اور نہ انڈا بڑا ہو؟ آپ نے فرمایا خدا کی طرف عاجزی کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے لیکن تم نے جو پوچھا ہے وہ نہیں ہوسکتا (بحار الانوار ج ۴ ص ۱۴۳) یعنی ذات مقدس الٰہی میں عجز نہیں ہے مگر فعل محال کے بارے میں قدرت خدا کے تعلق سے سوال کرنا یہ غیر معقول اور بے معنی سی بات ہے۔

جس مومن کا دل ایمان خدا سے اور اس کی محبت سے بھرا ہوگا وہ کبھی اپنے کو اکیلا و تنہا نہیں سمجھے گا کیونکہ جس بات پر اقدام کرے گا یہ یقین ہوگا کہ ہم ایک عظیم طاقت کے زیر نگرانی ہیں جو مشکل کو دور کرنے پر قادر ہے۔

جو خدا کو پہچانتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ خدا اس کی مدد کرنے والا ہے وہ مشکلوں کے سامنے صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے گا اور مشکلات کی حیثیت اس کے نزدیک سمندر کے جھاگ جیسی ہوگی جو بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ اور جتنی جتنی مشکل کی آگ اس کے ارد گرد بھڑکتی ہے اتنا ہی وہ زیر اسمہ یا کی طرح سخت و طاقتور ہو کر نکلتا ہے۔

تمام مشکل مقام پر فضل و عنایت خدا کا احساس کرتا ہے اور یہی اصلی احساس اس کی نمایت و تمایش کو تشکیل دیتا ہے۔ کوئی بھی ناکامی اس کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وہ کسی مشکل کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے بلکہ سعی مسلسل اور خلوص نیت کی بنا پر اپنے مقصد کو آخری منزل تک حاصل کر لیتا ہے۔

مومن بخوبی جانتا ہے کہ اس نظام میں کوئی بھی رنج بے ثمر نہیں ہوتا اور کامیابی مومنین کے لئے ہے اور جو مظلوم خدا کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں رکھتے خدا ان کی مدد کرتا ہے اور اوج عزت و عظمت تک ان کو پہونچا دیتا ہے اور بہت سے ایسے صاحبان عزت جو طاغی و باغی ہوتے ہیں ظالم و ستمگار ہوتے ہیں جو اپنی قدرت و طاقت کے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے جو انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتے خدا ان کی زنجیر گردن دیتا ہے۔

اس قسم کے کتنے ہی ظالم و جابر تاریخ بشریت میں گزرے ہیں جو ذلت کی موجوں میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انبیائے کرام انسانی اقدار کے کامل نمونے تھے انھوں نے مخالف قوتوں کا کس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ صرف اس لئے کہ لوگوں کی ہدایت کریں اور معاشرہ کو انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سوق کریں۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اہل شرک و ضلال کے سامنے سب سے پہلے انقلاب کی مشعل جلائی۔ اور ان کی تبلیغات کا تاریخ بشریت میں خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اور یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے توحید کی بنیاد ڈالی کو

مضبوط کیا ۔ کیا کوئی ایسا ہے جو ان کی ان کوششوں کا انکار کر سکے جن میں نہ تھکاوٹ کا احساس کرتے تھے اور نہ رنج و غم کا ؟ ہم کو سوچنا چاہئے کہ انسان کتنا صبر کر سکتا ہے اور اپنے ارادہ میں کتنا مضبوط ہو سکتا ہے ؟

اگر ان کی پر افتخار زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو تجلیات اخلاص، صفائے باطن، درگزر، رحمت و رأفت، ہدایت و انسان سازی سے شدید علاقہ کا درک و مس کیا جا سکتا ہے اور ان کی بقا کا اساسی راز یہ تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا ۔ اپنی پوری ہستی خوشی کے ساتھ اس کی راہ میں ہدیہ کر دی ۔ لہٰذا خدا نے بھی ان کو ابدیت و جاودانیت بخش دی ۔

علمِ خدا

خدا نہ تو کسی مکان میں سما سکتا ہے نہ اسکی ذات کے لئے کسی حد کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ زمین و آسمان میں کوئی نقطہ اس کے وجود سے خالی ہے۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور پورے نظامِ ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر اس کی دانش کی تابناک شعاعیں نہ پڑتی ہوں۔

دور ترین نقطۂ عالم میں بھی جو حادثہ ہوگا۔ کھربوں سال گزرے ہوئے واقعات اور کھربوں سال بعد ہونے والے واقعات اس کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اسی لئے جامع ترین تفسیر نفوذ و رسائی کی اس کے حوزہ علم تک پہونچنے سے عاجز ہے۔

اس کے وسعت علم کے دائرہ کے ادراک کے لئے دامنِ تفکر کو چاہے جتنا زیادہ وسیع کر دیں اور عقل کے بال و پر سے — جو ایک سکنڈ میں فطرت کے پورے وجود کو گھوم کر دیکھ لیتی ہے — چاہے جتنی پرواز کریں اور آزادی فکر کے ساتھ تلاش مقصد میں آگے بڑھیں پھر بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتے۔

جس طرح کہ ہم ایک جگہ اور مخصوص نقطہ میں ہیں اسی طرح اگر تمام جگہ ہوتے اور کوئی جگہ ہمارے وجود سے خالی نہ ہوتی تو اس صورت میں ہم سے بھی کوئی چیز پوشیدہ نہ ہوتی۔

کائنات دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ غیب و شہود۔ کچھ حقائق کا غیب میں ہونا۔ عدم محدودیت کی وجہ سے یا مادی نہ ہونے کی بنا پر یا ہمارے حواس ظاہری سے محسوس نہ ہو سکنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وجود ان امور محسوس میں منحصر نہیں ہے جو ہمارے تجربہ میں داخل ہوں۔

حقائق ہستی کے رموز و اسرار کے ادراک کے لئے ہم کو ایک ایسی سیڑھی چاہئے جس سے ہم چھلانگ لگا سکیں اور اس چھلانگ کی فعالیت و کامیابی فعال فکر کی قوت پر موقوف ہے

اگر یہ مدارج ہمارے لئے ممکن ہو جائیں تو بہت سے واقعات کو ہم بھی جان سکیں گے ۔

●

خداوند کریم عنوان غیب کے تحت ایک وسیع بینش کو ہستی کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ انبیائے الٰہی نے بھی اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ انسان کو عالم خلقت سے ایمان بالغیب کی طرف لے جائیں تاکہ محدود سے غیر محدود تک اور ظاہر سے باطن و غیب تک پہونچا دیں ـــــ لیکن جہاں تک خدا کا سوال ہے اس کے لئے کوئی چیز غیب نہیں ہے پوری کائنات اس کے لئے منزل شہود میں ہے ۔ ارشاد خدا ہے :۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ (الحشر / ۲۲)

پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے ۔ وہی بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

بشری مصنوعات ہمیشہ اپنے بنانے والے کے علم و ذہانت سے پیدا ہوتی ہیں اور مصنوع فنی لحاظ سے جتنا دقیق ہوگا وہ صانع کی علمیت پر اسی قدر زیادہ دلالت کرے گا ۔ اور اس صانع کے ہدف و مقصد پر بیشتر دال ہوگا ۔

اگرچہ اس کائنات کی عظمت کا انسانی مصنوعات سے کوئی تناسب نہیں ہے پھر بھی اس عالم کی عظمت اور اس کے متناسب موجودات کی صورتیں ۔ اور اس عظیم نظام میں پائی جانیوالی حکمت اور یہ خوبصورت و محیر العقول مناظر یہ سب اس ناظم و خلاق و مدبر کے غیر محدود علم پر دلالت کرتے ہیں ۔ بلکہ یہ مظاہر اس وجود فیاض کے علم و ارادہ و حکمت پر قوی ترین دلیلیں ہیں ۔ اسی خالق کون نے ان عجائبات کو ایک دقیق و منظم پروگرام کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے اور ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس وجود کے ظواہر اجزاء میں سے ہر ہر جزء میں اس کے وسیع علم کا مشاہدہ کریں ۔

جو حضرات لیبارٹریوں کے تجربات اور علماء کے نظریات کا تتبع کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ ممکن ہے کہ حیوانات ، نباتات ، حشرات کے اندر اس لامحدود علم کے عجائبات کثیرہ کا مطالعہ کریں

ان وہ فضائے آسمانی میں سیر ستارگان، اور بادلوں کے پر غوغا عالم، کہکشاؤں کی گردش کو ازل سے ابد تک کو جانتا ہے اور تمام اجرام بالا کے ایٹموں کی مجموعی تعداد، سطح زمین اور اعماق اوقیانوس کے ملیارد ہا چھوٹے بڑے موجود، فطرت میں نافذ جاری سنن و قوانین، ہر شی کے ظاہر و باطن کو بھی جانتا ہے، دلوں کے رازہائے سربستہ سے صاحبان قلوب سے زیادہ عالم ہے۔ اور یہاں ہم کو پھر قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے:-

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الملک - ۱۴)

اسی طرح ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (آل عمران - ۵)

بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے - اور وہ تو بڑا باریک بین واقف کار ہے (الملک/۱۴)

بے شک خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں (آل عمران/۵)

نیوٹن - (NEWTON) - گوش و چشم کے لئے کہتا ہے، کان کا بنانے والا آواز سے متعلق تمام قوانین کو مکمل طور سے جانتا ہے اور آنکھ کا پیدا کرنے والا ان پیچیدہ قوانین سے جو نور و رویت سے متعلق ہیں بخوبی مطلع ہے۔ اور نظام سماوات کو دیکھ کر ہم اس عظیم حقیقت تک پہونچ جاتے ہیں کہ اس نظام کا مدبر کوئی حکیم خاص ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۱۰ ص ۱۹۶)

اسی لئے علمائے طبیعت جو اعماق وجود میں دقائق نظم کے بارے میں وسیع اطلاع رکھتے ہیں اور زندہ و مردہ وجود کے بارے میں اپنے وافر تجربات کی بنا پر ایسی اطلاعات رکھتے ہیں جو دقیق حساب پر مشتمل ہوتی ہے ــــ اور صرف زندہ و مردہ وجود ہی کے بارے میں اطلاع نہیں رکھتے بلکہ ــــ خلیہ اور خون کے بارے میں بھی مطلع ہیں اور فعل و انفعال کی مختلف کیفیت، ظاہری و باطنی تحولات، اور مختلف مواد و عناصر کے تاثیرات کو اپنی علمی تحقیقات کے دائرے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور انفس و آفاق میں غیر محدود علم اور تحیر خیز حکمت کے آثار کا بہترین طریقہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات دوسروں کے بہ نسبت علم خدا کی

وسعت اور کمال اوصاف کو زیادہ جانتے ہیں ۔ اور اگر یہ لوگ ضمیر کی آواز کو نہ ٹھکرائیں تو وجود پروردگار کو روشن تر طریقہ سے لمس کرتے ہیں ۔

ایک مفکر کہتا ہے : ہماری دنیا ایک عظیم تفکر کی وجہ سے ایک میکانیکی مشین سے بہت زیادہ مشابہ ہے ۔ اور میں ایک نظریہ اور علمی تعریف کی بنا پر کہتا ہوں : ہماری دنیا ایک ایسے عظیم تفکر کی مخلوق ہے ۔ جو ہمارے مظاہر فکر سے کہیں زیادہ بلند ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ علمی افکار اسی ہدف کی طرف رواں دواں ہیں ۔

خدا کا علم صرف ماضی یا حال سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ مستقبل کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حال کو خدا کا علم انسانی علم سے ــ جو ہمیشہ وجود خارجی کا محتاج ہوتا ہے ــ کوئی شباہت نہیں رکھتا اور نہ یہ بات درست ہے کہ کہا جائے خدا کا علم مخلوقات میں تحقیق کرنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے ۔ اس کے علم کا قیاس انسانی علم پر کرنا قطعاً نامناسب ہے اور نہ ابھی تک ترقی یافتہ دنیا کے پاس کوئی ذریعہ ہاتھ آیا ہے جس سے یہ پتہ لگایا جا سکے کہ علم خدا کی کیفیت کی معرفت کا طریقہ کیا ہے اور کیسا ہے ۔ کیونکہ انسانی علم کے لئے ایک معلوم کا ہونا ضروری ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکے اور خدا کے یہاں یہ بات نہیں ہے کیونکہ علمی اصطلاح میں خدا کا علم حضوری ہے یعنی اس کے لئے کسی معلوم کا ہونا ضروری نہیں ہے جس سے علم خدا کا تعلق ہو ۔ بلکہ ہر شی اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے ۔ ذات خدا اگرچہ غیر از موجودات ہے لیکن اس کے باوجود وہ موجودات سے خارج بھی نہیں ہے ۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں : ماضی اور مستقبل بغیر کسی واسطہ کے اس کے سامنے حاضر ہیں ۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں : وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے لیکن وسائل و ذرائع کے ذریعہ نہیں کہ اگر وسائل ختم ہو جائیں تو علم خدا منتفی ہو جائے ۔ اس کے اور اس کے معلوم میں کوئی چیز بنام علم اضافی موجود نہیں ہے ۔ صرف اس کی ذات ہے اور بس ! [1]

---

[1] توحید صدوق ص ۴۳

حضرت علیؑ اپنی اس حدیث میں علماء کی ایجاد کردہ اصطلاح کے مطابق علم حضوری کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کیونکہ حوادث کے علم میں ذہنی صورتوں کا حصول خدا کے لئے نہیں ہے جو علم حصولی کی اساس ہے۔ البتہ اگر خدا کا علم حصولی ہوتا تو وہ ان صور ذہنیہ کا تحقق علم کے لئے محتاج ہوتا حالانکہ وہ غنی مطلق ہے۔

جس خدا نے عالم اور عالمین کو پیدا کیا، اور ہر حاجت کو پوری کرتا ہے اور ہر کمال ونعمت کا عطا کرنے والا ہے اور تمام کمالات وفضائل کا مجمع ہے اس کے بارے میں یہ کیوں کر سوچا جا سکتا ہے کہ وہ فاقی الحاجات ہونے کے ساتھ محتاج بھی ہے؟

صور ذہنیہ ہمارے اذہان میں ہمارے حسب خواہش باقی رہتی ہیں اور جب ان کو مہمل کر دیتے ہیں تو وہ مخفی ہوجاتی ہیں کیونکہ صور ذہنیہ ہماری مخلوق ہیں، علم حضوری کی اس لئے تعریف کرتے ہیں کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر حاصل ہو جاتا ہے اور علم حصولی واسطہ کا محتاج ہوتا ہے اور درحقیقت علم حصولی انسان کے آئینہ حواس پنجگانہ میں طبیعت وفطرت کا انعکاس ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان میں یہ فرق ہے کہ وہ غنی مطلق ہے، صور ذہنیہ کا محتاج نہیں ہے اور ہماری ذات ہی اسکی محتاج ہے۔

حوادث گزشتہ وآئندہ کی ترسیم ہماری محدود ہستی وافق فکر میں ہے کہ شخص زمان ومکان کا اشغال کرتے ہیں اور خارج میں اس زمان ومکان کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ صرف ذہن میں ہے۔ اور چونکہ ہم ایک مادی مخلوق ہیں اور قانون اضافت کی بنا پر مادہ ہمیشہ اپنے تکامل تدریجی وتغیرات میں زمان ومکان کا محتاج ہے۔ لیکن ایسا وجود جو ازل سے ابد تک تمام ظروف زمان ومکان میں موجود رہا ہو اور مادہ و اس کے لوازم سے آزاد ہو اس کے لئے گزشتہ اور آئندہ کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

اور چونکہ ہر حادث اپنے وجود وظہور میں اللہ کے وجود مطلق کا محتاج ہے لہٰذا خدا اور اس موجود کے درمیان کوئی حجاب وحائل فرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ تمام چیزوں کے ظاہر

وباطن پر محیط ہے اسی طرح دور، نزدیک، فاصلہ مکانی کا مفہوم ہمارے وجود کی محدودیت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (الانعام / ۵۹)

اور جو کچھ خشکی وتری میں (اس کو بھی) وہی جانتا ہے اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (سینہ معصومؑ) میں موجود ہے۔

فرض کیجئے ہم ایک ایسے کمرے میں کھڑے ہیں جو شاہراہ عام کی طرف ہے اور ایک چھوٹی سی کھڑکی سے بسوں اور کاروں کے ایک انبوہ کثیر کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر کی بات ہے کہ تمام بسوں اور کاروں کو ایک مرتبہ میں نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ اس چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے سے یکے بعد دیگر کاریں گزریں گی۔ اور نظروں سے پوشیدہ ہوتی جائیں گی اب اگر ہم ان کاروں کی حقیقت سے بے خبر ہوں تو یہی خیال ہوگا کہ یہ کاریں ایک ایک کرکے ایک طرف سے پیدا ہورہی ہیں اور دوسری طرف ختم ہو جارہی ہیں۔

درحقیقت یہ چھوٹی سی محدود کھڑکی ہماری نظروں میں کاروں کی گزشتہ اور آئندہ تصویر پیش کرتی ہے لیکن جو لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ہیں وہ تمام کاروں کو ایک ساتھ حرکت کرتے دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا کا ماضی ومستقبل ہمارے حساب سے بالکل اسی طرح ہے جو چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے سے کاروں کو دیکھ رہا ہے۔

علامہ کا بیان ہے : علم توپولوجی میں بیان کیا گیا ہے کہ عالم کی چار جہتیں ہیں لیکن دنیا میں ایسے بہت سے خواص ہندسی ہیں جن کے صرف تین ہی ابعاد ہیں جو صورت عامہ کے مخالف ہیں۔

اگر کوئی ناظر ایک سطح سے باہر ہو تو تمام سطح اس کے سامنے ہوگا اور پیش و پس اس کے لئے ایک بے معنی چیز ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ناظر "بعد زمانی" بعد چہارم جہاں کے اوپر ہوگا تو فضا

سے بعد ہی جہاں کو دیکھ سکتا ہے اور جہات اربعہ اس کے لئے بے معنی سی بات ہے ۔ اگرچہ اس قسم کے ناظر کا تصور مشکل ہے ۔

لیکن اگر کوئی ناظر سرعت نور کے ساتھ حرکت کرے تو فاصلہ صفر رہے گا ۔ گویا تمام نقاط فضائی جو معمیر ناظر میں پڑتے ہیں وہ سب یکجا اس کے لئے جلوہ گر ہوتے ہیں اور ناظر تمام حوادث کو یکجا دیکھ سکتا ہے اور اس قسم کے ناظر کے لئے زمانہ ٹھہرا ہوا ہوگا ۔ یعنی حوادث اگرچہ متفرق ہیں مگر نظر ناظر میں ایک آن میں ہوں گے ۔ وہ طول زمان کے ساتھ نظر ناظر میں مستمر نہیں ہوں گے اور اس ناظر کے لئے ماضی و حال و مستقبل بے معنی چیز ہے ۔ اس کی نظر میں سب ایک ہی آن میں ہیں ۔

اور جب ہم جانتے ہیں کہ خدا زمان و مکان سے ما فوق ہے تو تمام موجودات اور تمام حوادث خواہ ماضیہ ہوں یا مستقبلہ سب اس کے سامنے حاضر ہوں گے ۔

اور اس بنا پر ہم ہر وقت اس خالق کے سامنے ہیں جو ہر صغیر و کبیر کو جانتا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے :- إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (النحل ۹۱)

لہٰذا ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم اپنی مسئولیت کا احساس کریں اور ہر اس لغزش سے اجتناب کریں جو ہمارے انحطاط اور بُعد عن اللہ کا سبب بنے اور خداے علیم علی الاطلاق کے حضور میں سرنگوں رہیں جس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کے مختلف مراحل کو طے کرایا یہاں تک کہ ہم اس مرحلہ میں داخل ہو گئے جہاں ہمارے پاس طاقت و استعداد تھی ۔ اور ہم کو ان اوامر کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے جو ہمارے لئے طریق سعادت کھولتے ہیں اور انسانی بلند مقصد تک پہونچاتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اوصاف الٰہی سے مزین ہو جائیں اور لقائے خدا کے لئے زاد راہ اکٹھا کر لیں ۔ تاکہ رجوع الی اللہ یعنی رجوع الی مبدء او معید کا تحقق ہو سکے اور ہم ان مقامات تک تقویٰ کے بغیر نہیں پہونچ سکتے ۔ لہٰذا خدا کی معرفت اور اس کی توحید مسئولیت عمل انسان کے گردن پر امانت الٰہی کے عنوان سے رکھتی ہے ۔

لہ دانش رہبر ص ۲۳۶

مباحثِ عدل

نظریات دربارۂ عدل

تمام الٰہی صفات کے اندر عدل کی ایک الگ خصوصیت ہے۔ مسلمانوں کے نظریات عدل الٰہی کے سلسلہ میں مختلف ہیں۔ اپنے اپنے نظریات و اجتہادات کو مختلف اشکال سے پیش کیا ہے۔

۱۔ **اشعری حضرات** — مذہب اہل سنت کی وہ جماعت جو ابوالحسن اشعری کے پیرو کار ہیں — عدل الٰہی پر ہماری طرح کا ایمان نہیں رکھتے — اور افعال الٰہی میں عدل کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے نظریہ میں خدا جو کام بھی کرے وہ عدل ہے یہاں تک کہ اگر کسی عمل کے ذریعہ مستحق ثواب یا عقاب کے بغیر کسی کو ثواب یا عقاب کرے تو یہ فعل حسن ہے اور خالص عدل وحق ہے۔

یہ حضرات عدل کا انتزاع افعال خدا سے کرتے ہیں اور ہر اس چیز کو عدل کہتے ہیں جو خدا کی طرف مستند ہو اس بنا پر اگر خدا محسنین کو عقاب اور گنہ گاروں کو ثواب عطا کرے تو یہ عین عدل ہوگا اور اگر اس کے برخلاف کرے یعنی اچھوں کو ثواب اور بروں کو عقاب کرے تب بھی عدل ہے۔

یہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کے بارے میں عدل وستم کی تعبیر غیر مفہوم ہے اس سے یہ لوگ بزعم خود پروردگار عالم کی تقدیس کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ کیا بلکہ کوئی بھی دانشمند اس قسم کی نسبت کو جو تعصب و نارسائی فکر کی پیداوار ہے اسکو کبھی بھی تقدیس نہیں شمار کرے گا اس قسم کی فکر، نظم وحساب اصل علت ومعلول سبب ومسبب نظام عالم وافکار بشر میں انکار ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ نور عقل اپنی تمام نورانیت واشراقیت کے باوجود ادراکات دینی اور مسائل واحکام اسلام کے سلسلہ میں بجھ جاتا ہے۔ اور اس منزل پر آکر اس کی روشنی اتنی کم ہو جاتی ہے کہ بیشتر بافائدہ چیزیں بھی نہیں دکھائی دیتیں۔ لہٰذا ان مسائل میں عقول کی ہدایت پر بھروسہ کرنا ناممکن سی بات ہے۔

لیکن یہ دعویٰ نہ تو قرآن کے مطابق ہے اور نہ سنت کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید تعقل سے اعراض کو ضلال کہتا ہے۔ بلکہ معارف الٰہی اور عقائد دینی کی طرف تدبر و غور و فکر کرنے کے لئے انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس چراغ سے — جو کہ اتنا روشن ہے — استفادہ نہیں کرتے ان کی تشبیہ خدا نے جانوروں اور حیوانات سے دی ہے۔ ارشاد ہے: —

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ — (انفال — ۲۱)

اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر وہ بہرے گونگے (کفار) ہیں۔

رسول خدا ص فرماتے ہیں: لوگوں کی ہدایت کے لئے خداوند عالم نے دو راہنما معین کئے ہیں اول ظاہری یا دی جن کو انبیاء کہا جاتا ہے دوم باطنی یا دی جس کو عقل کہا جاتا ہے۔ (کافی ج۱ ص۲۵)

اس فرقہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دو فرقے اور ہیں معتزلہ اور شیعہ۔

۲۔ معتزلی حضرات:

یہ حضرات صفات الٰہی میں عدل کو مانتے ہیں اور عدل کو انھوں نے مستقل ایک بنیادی اصل قرار دیا ہے۔ اور اعمال انسانی میں قضا و قدر کو مجبوری کی حد تک ماننے کو خلاف عدل قرار دیا ہے۔

ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ نظام تکوینی اور نظام تشریعی دونوں میں افعال خدا مبنی بر عدالت ہیں اور جس طرح انسانی اعمال کو حسن و قبح کے مقیاس پر تولا جاتا ہے۔ افعال خدا بھی اسی معیار پر تولے جاتے ہیں۔ اور چونکہ از نظر عقل منطقی عدل ایک پسندیدہ اور ظلم و ستم ذاتاً ناپسند افعال ہیں اس لئے معبود برتر و حکیم علی الاطلاق کسی ایسے فعل کو انجام نہیں دے گا جو عقلاً مذموم بلکہ ممنوع ہو۔

ہم جس وقت کہتے ہیں: اللہ عادل ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ خداوند عالم حکمت و مصلحت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ خدا کے سلسلے میں حکمت کا مطلب یہ نہیں ہے

کر وہ اپنی کمیوں کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد تک پہونچنے کے لئے بہترین وسیلہ انتخاب کرتا ہے کیونکہ یہ تو انسان ہے کہ جس کی حرکت نقص سے کمال کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن خدا کا کام تو موجودات کو نقص سے خارج کرنا اور ان کو ان کے یعنی موجودات کے ذاتی مقاصد و کمالات کی طرف پہونچانا ہے۔ اور ہر مخلوق میں حکمت کا مطلب وہ غایات و مقاصد ہیں جو اسمیں خدا نے ودیعت کر دیئے ہیں۔ اور خدا ان چیزوں کو فیض وجود بخش کر دوبارہ ان کے استعداد کے تکمیل کی طرف لیجاتا ہے۔

لہٰذا یہ جان لینا چاہیئے کہ عدل کا مفہوم تو بہت وسیع ہے لیکن اس کے واضح ترین مصادیق "ظلم و عدوان سے دوری" ہیں۔

امام جعفر صادق ؑ نے عدل کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ خدا کے بارے میں عدل کا مطلب ہے کہ تم خدا کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت نہ دو کہ اگر وہی چیز تم سے سرزد ہوتی تو باعث ملامت ہوتی۔ (کفایۃ الموحدین ۔ ج ۔ ص ۳۴۲)

سلوک و عمل میں ہر ظلم و فساد اپنے اسالیب و اشکال اور انسان سے اس کے صادر ہونے کی صورتوں میں اختلاف تفاوت کے ساتھ ہمیشہ اس کا تحقق صرف یا تو جہالت و ناآگاہی یا ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یا پھر کینہ و عداوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہت سے ایسے بھی لوگ ہیں جو ظلم و فساد سے اظہار بیزاری کرتے ہیں لیکن عواقب امور کی جہالت کی وجہ سے کبھی ظلم و عدوان یا اعمال فاسدہ و قبیحہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔

کبھی کبھی انسان ایسی چیز کا محتاج ہوجاتا ہے کہ جہاں پر توانائی اور امکانات اس کے اختیار سے باہر ہوجاتے ہیں اور پھر انسان اپنے حصول مقاصد کے لئے بہت سے فسادات و تباہیوں پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ ضرورت، حرص شدید، الم و تکلیف، کینہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان دوسروں پر ظلم کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے ہاتھ سے اختیار دے بیٹھتا ہے۔ اور وہ اپنی ساری کوششوں کو حصول مقاصد کے لئے بروئے کار لاتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام اخلاقی و انسانی قید و بند کو توڑ دیتا ہے۔

اور مظلوم کی گردن پر سوار ہوتا ہے۔

مگر ذاتِ احدیت ان خصائص و نقائص سے پاک و منزہ ہے کیونکہ اس کے وسیع علم کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور نہ اس کے لئے کسی قسم کی عاجزی یا ذلت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہری بات ہے جو ذات مستجمع جمیع صفات الکمال ہوگی وہ کسی بھی شئی کی طرف ابداً محتاج و فقیر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ کہیں وقت نہ نکل جائے اور جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو بغیر کسی محدودیت کے وہ اپنے ارادہ کو پورا کرنے پر قادر ہے اس لئے وہ جادہ عدالت سے خارج ہو کر کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور نہ تشفی خاطر کے لئے کسی سے انتقام لے گا اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرے گا جو اس کے کمال کے منافی ہو۔

پس معلوم ہوا کہ اس قسم کے اعمال کے اسباب ذاتِ پروردگار میں متحقق ہی نہیں ہو سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ظلم و ستم کا مصداق وہ ذات حقیقی ہو جس کا فیض جود اور قدرت تمام جہات وجود پر متجلی ہے۔ خود قرآن مجید ذاتِ پروردگار عالم سے ظلم اور ہر اس عمل کی نفی کرتا ہے جو اس کی ذات مقدس کے مناسب نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:-

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (الروم/٩)

پس خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا مگر وہ لوگ (کفر و سرکشی سے) آپ اپنے اوپر ظلم کرتے تھے ـــــ

اس آیت میں خدا نے اپنی ذات سے ظلم کی نفی کی ہے اور بندوں کی طرف نسبت دی ہے۔ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا ایک طرف تو اپنے بندوں کو اقامۂ عدل کا حکم دے اور فحشاء و منکر و بغی سے منع کرے اور خود ان چیزوں کا ارتکاب کرے اور خلاف عدل کرے؟ ارشاد ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ - (النحل/٩٠)

اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے اور قرابتداروں کو (کچھ) دینے کا حکم کرتا ہے۔ اور بدکاری اور ناشائستہ حرکتوں اور سرکشی کرنے کو منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

(اس آیت میں خدا بندوں کو عدل کا حکم دے رہا ہے تو خود اس کے خلاف کیونکر اقدام کر سکتا ہے۔ مترجم۔)

قرآن کی نظر میں عدالت کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مقام عدالت کو اتنا اونچا کر دیتا ہے کہ بعثت انبیاء کا مقصد ہی اقامہ عدل قرار دیدیتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید / ۲۵)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

عدالت اجتماعی کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے۔ ابن عباس کا بیان ہے ایک دن میں حضرت علیؑ کے پاس ذی قار میں گیا تو دیکھا آپ اپنی جوتیوں کو ٹانک رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: اس جوتی کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے عرض کیا اس کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے اس پر فرمایا: اس پرانی جوتی کی قیمت میری نظر میں تمہاری اس حکومت سے زیادہ ہے الا یہ کہ میں اس حکومت کے ذریعہ عدالت قائم کر سکوں۔

اسلام عدالت اجتماعی کی اہمیت کا اتنا قائل ہے کہ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت عدالت اجتماعی کے جادہ سے منحرف ہو جائے اور دوسروں پر ظلم و تعدی کرنے لگے تو ان کو اس اقدام سے روکنا ہوگا چاہے اس کے لئے جنگ کرنا پڑے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا

بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الحجرات/۹)

اور اگر مومنین میں سے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے (تم بھی) اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع کرے تو فریقین میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو۔ بیشک خدا انصاف کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں ایک خاص لفظ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ دونوں میں صلح کراتے ہیں۔ ان کو بہت زیادہ دقت کرنی چاہئے تاکہ نزاع کا خاتمہ عدالت تامہ پر ہو اور کسی کے یہاں حق و عدالت میں کمی نہ ہو۔ کیونکہ جہاں پر دو ایسے فریقوں میں جنگ ہوتی ہے کہ جہاں ایک کی طرف سے دوسرے پر زیادتی ہو تو اگر یہ بھولی حضرات مصالحت کے ذریعہ سے مسئلہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اگر یہ معافی تلافی پر دباؤ ڈال کر ایک پارٹی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائے تو اس بات کا احتمال ہے کہ یہی عذر و معذرت روح کی اور زیادتی کو ان افزائی دیں اور زیادہ تقویت پہونچا دے جنھوں نے جنگ دستبردہ ہوتی ہیں کہ امتیاز کیا ہے اور بشری معاملات میں زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ظالم کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا جاتا ہے۔

اور بعض حقوق سے چشم پوشی اگرچہ فی نفسہ ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے مگر اس قسم کے مواقع میں ظالم کے دل میں اچھا اثر نہیں چھوڑتی۔ حالانکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ظلم و عدوان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص ظلم و زیادتی سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا۔

نظام وجود کو دیکھ کر ہم خود بھی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں ایک ایسا توازن و اعتدال ہے جو تمام ظواہر فلکی پر حکومت کر رہا ہے۔ اور اس اعتدال کا ظہور ذرات، الکٹرونیات،

اور تمام اجسام کی حرکت میں نمایاں ہے۔ کہکشاؤں کی رفتار، سیارات کے دورے کے ساتھ عالم جماد و نبات میں بھی ایک مخصوص توازن و اعتدال موجود ہے۔ بلکہ ایک زندہ موجود کے اعضا میں مکمل اعتدال ہے۔ مختصر یہ کہ ایٹم کے اجزائے داخلی سے لیکر بیشمار آسمانی کرات تک یہ سلسلہ موجود ہے۔ یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ تمام اجزائے عالم میں ایک انتظام تام موجود ہے۔

حضور سرور کائنات نے اس عدالت عمومی اور توازن تام اور یہ بات کہ کوئی چیز بغیر حساب کے نہیں ہے اسکو اپنے ایک مختصر و بلیغ جملہ میں بیان فرمایا: یہ عدل ہی ہے کہ جو آسمان و زمین کو اپنی جگہ پر روکے ہوئے ہے۔

قرآن مجید جناب موسیٰ کی زبان سے کہلوار ہا ہے:—

رَبُّنَا الَّذِىٓ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ / ۵۰)

موسیٰ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب صورت عطا فرمائی۔ پھر اسکو زندگی بسر کرنے کے طریقے بتلائے ہیں۔

جناب موسیٰ ایک مختصر سے جملہ میں نظم و لطف و زیبائی سے سرشار کائنات و آفرینش کو — جو من جملہ آیات خداوندی ہے — فرعون سے بتا رہے ہیں تاکہ اسکی فکری نجات پا جائے اور وہ الہٰی عادلانہ نظام کے وجود کو پوری کائنات میں محسوس کر سکے۔

نظام و اعتدال تو کائنات پر فطری طور سے نافذ ہے۔ فطرت کا ہر جزو سنن و قوانین طبیعت کے چوکھٹے کے اندر اپنے کمال و سیر خاص کی طرف رواں ہے۔ اور نظام عام اور اس پر حاکم روابط میں کسی بھی قسم کا انحراف نظام کونی میں اختلال و اضطراب کا سبب بن جاتا ہے۔

فطری طور پر ظواہر طبیعت میں کسی بھی قسم کی بے نظمی خود ظواہر میں عکس العمل کی نشاندہی کرتی ہے اور داخلی یا خارجی عوامل جو راہ تکامل میں مانع ہوں یہ ظواہر ان کو ختم کر دیتے ہیں اور رشد و کمال کے ادامہ کے لئے راستہ کو باز کر دیتے ہیں اور دوبارہ نظم کو برقرار

کر دیتے ہیں۔

جس وقت بدن پر بیماریوں کا حملہ ہوتا ہے یا میکروبات کا حملہ ہوتا ہے سفید دموی خلیا (و۔ ب۔ س) ان میکروبات کے حملہ کو روکنے پر جبری طور سے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور طبی علاج و معالجہ ان کے لئے خارجی مدد ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بدن کو پھر اعتدال پر لانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان پر جو نظام عدل لاگو ہے اس کا حال اس سے الگ ہوتا ہے کیونکہ انسان کو قدرت اختیار عطا کی گئی ہے۔

لیکن وہ خدا جو رحمان و رحیم، منعم و کریم ہے اس کے لئے محال ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جو عدل مطلق کے خلاف ہو۔ اور یہی قرآن کی آواز ہے:۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ (مومن/٦٤)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں تو اچھی صورتیں بنائیں اور اسی نے تمہیں صاف ستھری چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی اللہ تو تمہارا پروردگار ہے۔

عالم پر شر و فساد کی حکمرانی کیوں؟

خدا کی عدالت سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب خدا عادل ہے تو نظامِ عالم میں یہ بلائیں، خسائر، اشرار کا وجود کیوں ہے؟ معاشرہ کے طبقات میں نقائص کیوں ہیں؟ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات و اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ چھٹکارا نہیں حاصل کر پاتے اور اس کو عقدۂ لاینحل سمجھنے لگتے ہیں۔

وہ لوگ کہتے ہیں: یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جب عالم ایک حکمت کے پیش نظر پیدا کیا گیا تو پھر اس میں آلام و شرور کی حکومت کیوں ہے؟ اور شقاوت و بدبختی کا دور دورہ کیوں ہے؟ اور چاروں طرف خرابیاں اور نقائص کیوں موجود ہیں؟

آخر دنیا کے گوشہ و کنار میں وحشتناک حوادث ہستیٔ بشر کو کیوں مورد حملہ قرار دیتے ہیں؟ اور ہزاروں ویرانیاں، تلفات، نقصانات کیوں ہوتے ہیں؟

کیوں یہ خوبصورت ہے اور یہ بدصورت ہے؟ یہ صحیح ہے یہ بیمار ہے؟ یہ سب برابر کیوں نہیں خلق کئے گئے؟ کیا یہ اختلافات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ سرزمین حیات پر کوئی عدالت کارفرما نہیں ہے؟

جب تک دنیا سے ظلم، تبعیض، آفت، مصیبت، نقص، ضعف، فقیری، بیماری کا خاتمہ نہ ہو جائے نظامِ عدالت کا تحقق ناممکن ہے!

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ مسائل وجود میں ہماری تحقیقات ہم کو ان ظواہر وجود کے گہرائی کی انتہا تک نہیں پہونچا تیں اور نہ ان کی نہایتوں اور غایتوں کی توجیہ و تعلیل کے لئے کافی ہیں۔

یہ درست ہے کہ پہلی نظر میں تلخ حوادث اور بلایا ان کی حقائق کی معرفت کے بغیر ہم کو یہ تصور عطا کرتی ہیں کہ نظام عالم میں عدل کا وجود نہیں ہے اور جب انسان اس بات کو شدت سے سوچتا ہے تو اس کے فکری تاثرات میں عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اسی تاثر کے عالم میں وہ مسلسل غیر منطقی تحلیل کرنے لگتا ہے۔

لیکن اگر ذرا گہرائی اور بنیادی طور پر غور و فکر کریں تو ہم کو یہ پتہ چل جائیگا کہ ہمارے اس تصور کی بنیاد صرف اس بات پر قائم ہے کہ ہم ان موجودات پر حکم لگانے کے سلسلہ میں ہی اور ان لوگوں کی ذات کو جو ہم سے ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ مربوط ہیں اور اپنے اور ان لوگوں کے مصالح کو معیار بناتے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے نفع بخش ہے وہی حسن اور جو ہمارے لئے مضر ہے وہی قبیح ہے پس حسن و قبیح کا معیار وہ ہے جس کو ہماری قاصر نظریں سنت ہائے حاکم بر ہستی پر دقیق معرفت کے بغیر حسن و قبیح دیکھتی ہیں۔ پس کیا حوادث کا ارتباط صرف ہم سے ہے تاکہ ہم اپنی ہی ذات کو حسن و قبیح کا معیار قرار دیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

ہماری مادی دنیا تغیر پذیر ہے جو حوادث آج نہیں ہیں وہ کل ہو سکتے ہیں۔ کچھ چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری چیزیں آجاتی ہیں۔ آج جو چیز بعض لوگوں کے لئے مفید ہے کل ہو سکتا ہے اس کا خارجی وجود ہی نہ رہے۔ لیکن چونکہ ہم انسان ہیں اور اپنے سے اور کائنات سے ایک لگاؤ اور علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاتھوں سے چیزوں کا نکل جانا برا اور ہمارے ہاتھوں میں آجانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ انسانوں اور اشیاء سے اس کی وابستگی کو چھوڑ کر بھی عالم کے تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے مختلف حوادث پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اگر امکان تغیر ہی ختم ہو جائے تو کوئی حادثہ نہ ہوگا اور پھر ایسی صورت میں خوب و بد کا بھی وجود نہ ہوگا ـــ (یعنی یہ تمام چیزیں تو تغیر عالم کے لوازم سے ہیں ان سے عالم کے نظام کا خلاف عدل ہونا لازم نہیں آتا ـــ مترجم)

اور پھر اس خیالی دنیا میں نہ نقص ہوگا نہ کمی ہوگی نہ نظروں کے سامنے رشد و نمو کا وجود

ہوگا۔ اسی طرح اس خیالی دنیا میں تضاد و تباین، انتشار و تفاوت، حرکات و ترکیبات میں تنوع کچھ بھی تو نہ ہوگا۔ اور جس خیالی دنیا میں کمی نہ ہوگی۔ ضابطہ و قانون نہ ہوگا۔ انسانی، اخلاقی اجتماعی حد بندی نہ ہوگی وہ بھی تو تغیر پذیر ہوگا اور حرکات سیارات کا مولود ہوگا اور جب تحول و تفاوت کا خاتمہ ہو جائیگا تو زمین، سورج، چاند، دن، مہینہ، سال کچھ بھی باقی نہ ہوگا۔

جس دنیا میں رنج و مصیبت نہ ہوگی، حرکت و سعی نہ ہوگی اور جس وقت خطرات کا احساس نہ ہوگا احساس امنیت پر مسرت و سرور بھی حاصل نہ ہوگا۔

جس دنیا میں امیدوں اور آرزوؤں کا ہجوم نہ ہو اور جانداروں میں عطوفت و محبت و مودت کا اثر ختم ہو جائے وہاں پر انسانوں کے روابط پائیداری پر استوار ہی نہیں ہو سکتے اور جستجوئے کمال کا جذبہ انسان کے وجود کے گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔

•

ایک جہان بینی وسیع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ممکن ہے آج جو چیز ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ حال یا استقبال میں دوسرے کے لئے فائدہ مند ہو۔ کیونکہ کائنات کی تلاش و حرکت برائے تحقیق ہدف عالم ہے اور تمام موجودات کے سود مندی کے لئے ہے۔ اور بہت سے افراد اس سلسلہ میں نقصان اٹھاتے ہیں اور یا پھر وہ تمام افراد انسانی کے لئے مفید نہیں ہے۔

البتہ اگر ہمارے امکان میں یہ بات ہوتی کہ معارف الٰہیہ کے سمندروں میں غوطہ لگا کر علوم کی انگلیوں سے اسرار و رموز کے حقائق کے اوراق کو تلاش کرتے تو یقیناً حوادث کے عواقب و فلسفہ ہماری نظروں میں واضح و روشن ہو جاتا۔ لیکن جب ہم یہ جانتے ہیں کہ آج کے عوامل علل سابقہ کے سلسلہ کا نتیجہ ہیں اور یہی بعد والے حوادث کے اسباب اور آنے والے معلولات کی علل ہیں تو پھر ہم کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں اور اس پر خیر و شر کا حکم لگا رہے ہیں یہ حکم جامع اور عمیق نہیں ہے۔

ہاں اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ اوپر سے مجموعہ عالم کے ہر جانب کو — خواہ ایجابی ہو یا سلبی — دیکھ سکتے اور تمام اسرار اور مشتملات عالم کو دیکھ سکتے اور ایک حادثہ کے اثر و نتائج پر انسان کی طول تاریخ گزشتہ و آئندہ اور تمام موجودات کی نسبت اور ان کے متعلقات اور تمام سازمان ہستی میں، شعاع ازلیت و ابدیت تک مطلع ہو سکتے اور یہ دیکھ سکتے کہ اس حادثہ کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔ تب ہمارے لئے یہ حکم لگانا ممکن ہوتا کہ یہ حادثہ شر ہے لیکن کیا انسان کے بس میں ہے کہ تمام اسرار عالم کا اتنا کامل و مکمل احاطہ کر سکے ؟

لیکن جب ہمارے پاس اس تحقیق کی طاقت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں ہمارا اقدام بہت ہی ناقص ہے اور اس عالم کے اسرار و رموز معقدہ کے چہرے سے نقاب کشائی ہمارے لئے ناممکن ہے تو پھر ہمارے اوپر واجب ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور ایسا ناقص فیصلہ کرنے سے توقف کریں۔ اور ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ اپنے مخصوص منافع و مصالح کو اس وسیع عالم کے نظام عام کے لئے مقیاس نظر نہ قرار دیکر فیصلہ کریں؛ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے اضافی نظریات کو — جو ظروف خاص کے تابع ہوتے ہیں — آخری حکم کا مدرک قرار دیں۔

بسا اوقات تحقیق مقصد کے لئے خود فطرت کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ عادۃً اس کا تصور انسان کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ ہم کیوں یہ تصور نہ کریں کہ یہ غیر متوازن و غیر متناسب حوادث ایسی زمین ہموار کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس سے جدید مولود پیدا ہو سکے جو زمین میں خدا کا جانشین ہو۔ ہو سکتا ہے زمانہ اور محیط کے اوضاع و احوال اس بات کے متقاضی ہوں۔

اگر وحشتناک تحولات و انقلابات مقصود ھدف کے پیش نظر جاری و ساری نہ ہوتے اور ادوار مختلفہ میں دوام باقی نہ ہوتے تو آج زمین پر مختلف النوع حیوان و انسان کا وجود نہ ہوتا۔

آخر چند حوادث و ظواہر استثنائیہ کو دیکھ کر ہم عالم وجود کو بے عدالتی ہرج و مرج

دبے پائیگی سے کیوں متہم کریں؟ اور چند محدود و چھوٹے غیر موزون حوادث کو دیکھ کر انگشت اعتراض کیوں دراز کریں؟ اور ان تمام معقول مظاہر و عجیب و دقیق ظرائف کو بھول جائیں جو لامتناہی حکمت اور ارادہ مطلقہ تامہ کے آثار ہیں؟

بشری علوم اپنے تمام فرہنگی کے باوجود بہت تھوڑے سے اور محدود و قاصر ہیں۔ اور انسان تو ابھی معلومات کی ابتدا ہی میں ہے اور یہ غرور علمی صرف الفاظ کی بازی گری ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ جو انسان ابھی صرف اپنے بدن کے اسرار سے کامل طور پر واقفیت نہیں رکھتا وہ نظام ہستی کے بیکراں اسرار کو حل کرنے کی کوشش کرنے لگے تو یہ ایک حماقت کے سوا کیا ہے؟

کارل — (A.R.K) — کہتا ہے ہمارے جسم سے زیادہ کوئی شی قریب نہیں ہے اس کے باوجود بھی ہم اپنے جسم کے اسرار کثیرہ سے واقف نہیں ہیں۔

انسان جب تمام جوانب ہستی میں "تدبیر" کو دیکھتا ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ کائنات ایک روشن تکاملی هدف دار کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی ہر چیز ایک معین میزان کے تابع ہے اور اگر کسی چیز کو وہ معقول و موجہ نہ دیکھے تو اس کو اپنی کوتاہ نظر سمجھے۔ اور یہ احساس کرے کہ اس کا محدود وجود کائنات کے تمام اسرار و اہداف کو نہیں جان سکتا۔ لیکن نفس عالم وجود میں کوئی نقص نہیں ہے۔

کائنات میں تلخ حوادث کا ہونا ہماری نظر میں اس دیہاتی کے قصہ کے مانند ہے کہ ایک دیہاتی شہر میں گیا تو اس نے دیکھا بڑے بڑے بلڈوزر قدیم عمارتوں کے گرانے میں مشغول ہیں تو اس نے خیال کیا یہ عمارتوں کا گرانا اور اس کو ویران کر دینا بیوقوفی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ تخریب اور قدیم عمارتوں کا گرانا کسی پروگرام اور کسی ہدف و مقصد کے بغیر تھا؟ اور کیا دیہاتی کا فیصلہ منطقی ہے؟ ہرگز نہیں وہ تو صرف عمارت کا گرانا دیکھ رہا ہے۔ اسے کیا معلوم یہ انجینیروں کے نئے پلان کے مطابق یہ کام انجام دیا جا رہا ہے؟

ایک دانشمند کا کہنا ہے کہ : جو لوگ ظواہر وجود پر نقص و کمی و شر کا حکم لگاتے ہیں انکی مثال ان بچوں کی طرح ہے جو ایک ایسے تھیٹر کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کو اپنے پروگرام کے مطابق ایک جگہ دکھا کر دوسری جگہ دکھایا جائیگا ۔ مگر بچوں کے نزدیک طنابوں کا اکھاڑنا ، چیزوں کو اکٹھا کرنا انسانوں اور حیوانوں کی وہاں آمد و رفت کا ہونا یہ سب باتیں تھیٹر کے ختم ہوجانے کا اعلان ہوتا ہے ــــ حالانکہ وہ دوسری جگہ دکھایا جائیگا ۔

اگر ہم عمیق و وسیع نظر سے مصائب و بلاؤں کے وقوع کو دیکھیں اور ان سے صحیح استفادہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہ نعمت یا مصائب و بلا نہیں ہیں ۔ بلکہ نعمت کا نعمت ہونا یا مصائب کا مصائب ہونا اس کے سامنے انسان کے ردعمل سے مرتبط ہوا کرتا ہے ۔ اور ایک ہی شی دو مختلف شخصوں کے لحاظ سے دو صفتوں سے متصف ہوتی ہے ۔

انسان کے لئے مصیبت و تکلیف ایک قسم کی خطرے کی گھنٹی ہے جسکے ذریعہ انسان اپنی کمی اور نقائص و غلطیوں کی اصلاح کرسکتا ہے ۔ اور درحقیقت یہ الم و تکلیف ایک فطری نعمت و کنٹرول ہے ۔

اگر مالداری موجب عیاشی و تن پروری ہو تو نکبت و بدبختی ہے ۔ اور تنگدستی و فقیری اگر سبب تربیت و پرورش اور تکامل روح ہو تو نعمت ہے ۔ اس لئے مطلقاً ثروت کو خوشبختی اور فقیری کو بدبختی نہیں کہا جاسکتا ۔ اور یہ قانون تمام طبیعی مواہب میں قابل انطباق ہے ۔

جو قومیں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور اپنے وجود کے بقا کے لئے سعی و عمل کرتی ہیں وہ زندہ اور با اقتدار ہوتی ہیں ۔ ہم جس وقت عمل کی صفت سعی اور مثبت کوشش سے کریں اس وقت ہم کو وہ مشکل دور نہیں بھول جانا چاہئے جو انسان کو اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے ذاتی قوتوں کی تائید کے عمل میں آیا تھا ۔ اور جو قوم سعی و کوشش نہیں کرتی اور مطمئن فضا میں زندگی بسر کرتی ہے وہ مادی سہولت اور شہوات و لذائذ

غرق ہونے کی وجہ سے بہت جلد شکست کھا جاتی ہے۔

اور بسا اوقات انسان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے ایسی ایسی بڑی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے کہ اگر وہ سختیاں نہ ہوتیں تو مقصد کی بزرگی ظاہر نہ ہوتی۔ اسی لئے گزرگاہ تکامل میں ہموار راہ اور اندھی و میکانیکی حرکت قابل قبول نہیں ہے۔ اور انسانی کوششیں بغیر عزم محکم کے تغییر اساسی تک نہیں پہونچ سکتیں کشمکش و تضاد جانور کو صحیح راستہ پر چلانے والا قائد ہے، جمادات ضغط و فشار کے نتیجہ میں چور چور ہو جاتے ہیں لیکن انسان مشاکل و صعوبات میں گھر کر مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور بشر کا نبوغ شر و فقر کے بغیر ہوتا بھی نہیں۔

لذت مطلق اور عشق دنیا اور دنیا کو ہدف بنا لینا گمراہی و ابتذال ہے۔ بدبخت ترین لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی تربیت نعمت تامہ میں حیات کی تلخیوں سے دور رکھ کر زمانہ کے گرم و سرد کو چکھے بغیر کی جائے۔

خواہشات کی پیروی یا آوارہ حرکت عزم محکم، سعی مسلسل کے ساتھ جمع نہیں ہوتی کیونکہ نفس و استقامت کی طاقت لذت یا لذت کی ضد ہے۔

لیکن جس طرح دونوں کا جمع ہونا محال ہے ویسے ہی دونوں کی نفی بھی محال ہے لہٰذا انسان کا فریضہ ہے کہ سعی مسلسل کرتا رہے تاکہ ذاتی طور پر قوۃ ارادہ و ثبات نمو پاتا رہے اور لذت و عیش کی طلب اسی حساب سے کم ہوتی رہے۔

دنیا کے شیریں و تلخ حقائق سے بے خبر نازوں کے پروردہ حضرات چونکہ بے اندازہ رفاہ و آسائش میں رہے ہیں بھوک کی سختی کبھی برداشت نہیں کی ہے اس لئے نہ وہ لذیذ ترین غذا کی لذت سے آشنا ہیں اور نہ لذت حیات کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ زیبائیوں کا احساس کر سکتے ہیں کیونکہ مشکلات سے آشنائی ناکامیوں اور تلخیوں کا مزہ چکھنا، دشواریوں کے برداشت کی طاقت رکھنا، رنجوں اور مصیبتوں کا تحمل کرنا ـــ یہ وہ چیزیں ہیں جو قدم بہ قدم انسان کے ساتھ ہیں ـــ لذائذ حیات سے فائدہ اٹھانے کی شرط ہے۔

جب انسان ناگوار حوادث کے نیچے پستا ہے اور دنیا کی بلندی و پستی کو لمس کرلیتا ہے تب اسکی نظر میں گرانقدر زندگی کی معنوی و مادی شرائط آتے ہیں۔

حیات مادی میں سرگرم ہونے کی وجہ سے انسان دنیا کا غلام بن جاتا ہے۔ اور آزادی ضمیر کو کھو بیٹھتا ہے، حیات ابدی سے غافل ہوجاتا ہے یا تغافل کرنے لگتا ہے۔ اور جب تک خواہشات کے پردے اس پر سایہ فگن ہیں اور اس کی روح تاریکیوں میں اسیر ہے وہ مادی امواج میں یک تنکے کی طرح ادھر ادھر مارا پھرے گا۔ اور خدا کے علاوہ سب ہی کا اسیر ہوگا۔ اس لئے وہ ایک ایسے بیداری کے وسیلہ جو پختگی افکار کا باعث ہو اور نقش مثبت رکھتا ہو کا محتاج ہے تاکہ اس کو جہان فانی کی یاد دلائے اور آزادی نفس — جو اسلامی تربیت کا مطلوب نہائی ہے — تک پہونچائے۔ اور ان تمام موانع سے آزاد کرائے جو بشریت کو کمال و رفعت سے روکتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ تہذیب نفس بہت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لئے خواہشات سے چشم پوشی کرنا ہوگا اور یہ بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ اس قیمتی کوشش سے نفس استعداد روحانی کے لئے آمادہ ہوجائیگا۔ مگر یہ بھی مسلم ہے کہ گناہوں اور لذتوں سے اجتناب ایلوے سے زیادہ تلخ ہے اور بچھو کے ڈنک اور سانپ کے کاٹنے سے زیادہ سخت ہے۔ انسان اپنے حل مشکلات کے لئے اور رفع موانع کے لئے آہنی قدرت آسانی سے نہیں رکھتا۔ اور شدید مقاومت کے بغیر بلندیوں تک نہیں پہونچ سکتا۔

مصائب عامل بیداری و حرکت ہیں

جو لوگ کامیابیوں اور قدرت کے نشہ میں مست ہیں اور ان کی ارواح و عقول پر خواہشات کے غلبہ نے ان سے انسانی اقدار چھین لئے ہیں۔ گوشہ و کنار عالم میں واقع ہونے والے تلخ حوادث کبھی ان کے افکار و بیداری کے لئے زمین ہموار کر دیتے ہیں اور ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے اٹھا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کمال انسانیت کی طرف سیدھی راہ پر گامزن ہوجائیں اور مستقبل میں ایک نیک اور ثمربار نتیجہ کے حامل ہوجائیں۔ اور بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے ان حوادث و آلام کے نتیجہ میں تابندہ مستقبل کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

نقصان دہ اثرات، وحشتناک غرور و غفلت اور ان ترقی و درس کے نتائج میں جن کو بشر ان حوادث سے سیکھتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حوادث و آفات — اگرچہ ان میں نسبی شر بھی ہوتا ہے — بہت سی نعمتوں اور پوشیدہ الطاف پر مشتمل ہوتے ہیں جو انسان کو بیداری اور عزم محکم عطا کرتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ دشواریاں تکامل کی مقدمات ہیں اور اقدار انسانی کے لئے زمین ہموار کرنے والی ہیں۔ اور انھیں دشواریوں سے درجہ خلوص و بلندی یا انحطاط کا انسان میں پتہ چل جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا
إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ - أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ

وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ (البقرہ ۱۵۰ - ۱۵۲)

اور ہم تمھیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنیوالوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑی تو وہ (بے ساختہ) بول اٹھے ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں۔ خوشخبری دیدو کہ انھیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

مشہور فلسفی امرسن (EMERSON) کہتا ہے: وہ تغیرات جو کبھی لوگوں کی سعادت کو چکنا چور کردیتے ہیں۔ وہ اسی طبیعت کی طرف سے انتباہ ہے جس کی خلقت نمو اور تکامل کے لئے کی گئی ہے۔ کیونکہ جب روحِ انسان میں عبادت خالق کا شوق پیدا ہوجاتا ہے تو پھر روحیں اپنا وہ نظام جو مال و دولت اور دوستوں پر مبنی تھا چھوڑ دیتی ہیں جس طرح چھوٹی مچھلیاں اپنی پہلی جگہ ترک کردیتی ہیں تاکہ اپنے لئے ایک لائق دور کا انتخاب کرسکیں۔

مصیبت کے نتائج ذہن بشر پر اس وقت واضح ہوتے ہیں جب مصیبت کو گزرے طویل زمانہ ہوجاتا ہے، امراض، نقص اعضاء، فقدان ثروت، دوستوں کی موت، ضرورت سے زیادہ مصائب کی وجہ سے مایوسی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا جبران فوراً نہیں ہوتا لیکن جب زمانہ گزرجاتا ہے تو ان حوادث میں چھپی ہوئی طاقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

رشتہ داروں کی موت ابتداً سوائے مصیبت اور محرومیت کے کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہدایت وارشاد کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ یہ حادثات ہماری زندگی میں انقلابات لاتے ہیں۔ بچپنا اور جوانی جن کو بہرحال ایک دن ختم ہونا ہے ان کو خاتمہ تک پہونچاتے ہیں۔ زندگی اور اس کے کاموں سے مانوسیت کو ختم کردیتے ہیں۔ لیکن اسکی جگہ آدمی کے اندر ایک ایسی ہمت مردانہ پیدا کردیتے ہیں جس میں نمو و کمال کی استعداد کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جو شخص آفتاب کی حرارت کی پرواہ کئے بغیر ، اور کسی نگرانی کے بغیر اگر مثلاً گلاب اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کو انجیر کے درخت کی طرح ہو جانا چاہئے جس کو باغبان نے لاپروائی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور بے اعتنائی کی وجہ سے باغ کی دیواریں بھی گر چکی ہوں کہ وہ درخت کتنا قوی اور طاقت ور ہوتا ہے جس کے پھلوں سے لوگ استفادہ کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں آکر پناہ لیتے ہیں۔[1]

یقیناً خدا ایسے عالم کو خلق کر سکتا ہے جس میں نہ بد بختی ہو نہ درد و رنج و تکلیف لیکن اگر ایسا عالم پیدا کر کے انسان سے اسکی قدرت و آزادی و اختیار کو سلب کرے اور دیگر موجودات کی طرح انسان کو بھی اس کائنات وسیع کے اندر بے ارادہ و اختیار ، بے شعور موجود بنا دیتا جو فطرت کے تحت تاثیر کوئی شکل و صورت اختیار کر لیتا تو کیا ایسے موجود کو انسان کہنا مناسب ہوتا ؟

کیا انسان اپنی تمام استعداد کھو کر اور گران بہا ترین سرمایہ دیکر — یعنی حریت و آزادی — اپنا کمال حاصل کر لیتا ؟ اور کیا اس کا انجام انحطاط و سقوط کی صورت میں ظاہر نہ ہوتا ؟ اور کیا کائنات سے اس کی خیر و زیبائی — یعنی ہر ایک کی اس کے ضد سے تشخیص ختم نہ ہو جاتی ؟

وہ خدا کہ جو حکیم ہے اور جسکی حکمت پورے موجودات پر حاکم ہے اس نے یہ چاہا کہ حوادث کی تجدید و اتقان سے اور انسان کو حریت و اختیار — یہ اسکی ایسی نعمت ہے کہ جس کی قیمت لگائی ہی نہیں جا سکتی — دیکر اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائے ۔

انسان کے اندر اس نے اچھائی و برائی کی قدرت عطا کی ۔ اور کسی بھی شی — اچھائی یا برائی — پر مجبور کئے بغیر انسان سے ہمیشہ خیر کا منتظر رہا ۔ کیونکہ شر اور قبیح کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا ۔ ہاں اس نے فعل حسن جمیل کو ہمیشہ پسند کیا ہے اور اس کے فعل اور ترک ضد

---

[1] فلسفہ اجتماعی ص۲۹۵ ، ص۲۹۶

پر اتنا اجر معین کیا ہے جس کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ اور بد طینتی اور جان بوجھ کر شر کرنے سے روکا ہے اور عذاب الیم سے ڈرایا ہے۔ اب یہ انسان کے اختیار کی چیز ہے کہ جی چاہے تو اسکی باتوں پر اپنے ارادہ و اختیار سے عمل کر کے عبد شکور رہے یا اسکی ہدایات کی مخالفت کر کے عبد کفور رہے۔

ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ طہارت و تزکیہ کی طرف پلٹنے کا راستہ کھلا رکھا ہے کہ اگر کبھی انسان سے لغزش ہو جائے تو دوبارہ خدا کے دامن لطف و رحمت میں پناہ لے سکتا ہے۔ یہ خدا کا بہت بڑا لطف و عدل اور عظیم رحمت ہے۔

نیک عمل کرنے والے کو اگر خدا فوری جزا دیدے تو غیر صالح عمل اور بد میرتی پر کوئی فضیلت نہ ہوگی جس طرح کہ اگر برے کام پر فوراً سزا دیدے تو فضیلت کو رذالت پر اور طہارت کو خبث پر کوئی فضیلت نہ ہوگی۔

کائنات کی بنیاد اضداد پر ہے اور مادہ کی یہی تحول پذیری والی صفت کے باعث فیض خدا دنیا میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اگر مادۂ کائنات دیگر موجودات سے مل کر مختلف صورتیں اختیار نہ کرتا اور جدید صورت اختیار کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہوتی تو اس کائنات میں کبھی بھی تنوع اور تکامل کا وجود نہ پایا جاتا۔ لامتغیر و ثابت کائنات، جامد سرمایہ کی طرح ہے جس سے کوئی سود حاصل نہیں ہو سکتا۔ دراصل گردش سرمایہ ہی سود و منافع کا سبب بنتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص سرمایہ اپنے جریان میں نقصان دہ ہو۔ لیکن کائنات کے تمام مادے دنیا کے سرمایوں کی طرح ہیں جو یقیناً گردش سے سود آور ہوتے ہیں۔

مادہ کی صورتوں میں تضاد بھی فائدہ بخش ہے کیونکہ یہی چیز ہستی کو کمال کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ بات تو ہم اس وقت کہہ رہے ہیں جبکہ لفظ شر کو دنیا میں جس طرح استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں استعمال کریں۔ لیکن اگر غور و خوض کیا جائے ——— تو پتہ چل جائے گا شر یعنی بدی یہ حقیقی صفت نہیں ہے بلکہ یہ بدی کے معنی اضافی ہیں — مثلاً اگر اگلنے والے اسلحے اگر دشمن کے ہاتھ میں ہوں تو ہمارے لئے شر ہیں۔ لیکن اگر ہمارے ہاتھ میں ہوں تو خیر ہیں

شر نہیں ہیں اور اگر نہ ہم ہوں نہ ہمارا دشمن تو یہ اسلئے نہ اچھے ہیں نہ برے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ کائنات کا نظام ایک مستقل بر ریاضی ہے اور دنیا کا سسٹم بنانے والے نے کچھ اس طرح بنایا ہے کہ ہماری خواہشات کا پوری ہونا ضروری نہیں ہے حالانکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری لامحدود خواہشات بغیر کسی مزاحمت اور مانع کے پوری ہوجائیں لیکن طبیعی قوانین ہمارے خواہشات کو پوری کرنے کے جوابدہ نہیں ہیں اور خواہشات بھی ایسے ہیں کہ جو بعض قطعی نہیں ہیں۔ لیکن جب ہماری خواہشیں پوری نہیں ہو پاتیں تو ہمارے لئے بے چارہ رنج کا سبب بنتی ہیں اور ہم اپنے عوامل ناراحتی کو شر سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ تعبیر ہم اس وجہ سے کرتے ہیں کہ شئون ہستی سے آگاہی نہیں رکھتے اور خود اپنے اندرونی اور بیرونی عوامل سے ناواقف ہیں۔

اگر کسی کو معلوم ہو کہ چراغ میں تیل نہیں ہے اور چراغ جلائے اور وہ نہ جلے تو جلانے والا آہ وزاری نہیں کرے گا۔ زمین و آسمان کو گالیاں نہیں دے گا۔

کائنات اپنی مسلسل کے ساتھ مشخص ہدف کی طرف سیر و حرکت کر رہی ہے اور اپنے اسباب وعلل کے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ انسانوں کی خواہشات اور اس کی ہوس کائنات کو اپنے پروگرام سے ہرگز نہیں روک سکتی۔

اس لئے ہم کو یہ قبول کرلینا چاہئے کہ اس کائنات کے کچھ جریانات ہماری خواہشوں کے مطابق نہیں ہیں اس لئے اپنے رنج و غم کو دنیا میں ظلم و ستم سے تعبیر نہیں کرنا چاہئے اور نہ فلسفی لحاظ سے بے عدالتی سمجھنا چاہئے۔

ایک دانشمند کہتا ہے طبیعت زیادہ روی اور اسراف کو نہیں جانتی، طبیعت تو ہمیشہ راستگو اور بزرگ ہے۔ اس کے عمل میں نہ کوئی لغزش ہوتی ہے نہ خطا۔ جو کچھ غلطی اور لغزش ہوتی ہے وہ صرف ہماری وجہ سے طبیعت عجز و ضعف سے جنگ کرتی ہے اور اپنے اسرار و رموز سوائے خردمند، پاک اور متقی کے کسی دوسرے پر نہیں کھولتی۔

حضرت علیؑ دنیا کی مذمت فرماتے ہیں لیکن جو لوگ دنیا کو خوب پہچان چکے ہیں ان کیلئے

دنیا کو اچھی جگہ فرماتے ہیں۔ اور آپ خود اگرچہ شدائد و آلام سے پوری زندگی دوچار رہے لیکن لوگوں کو ہمیشہ خدا کی عدالت مطلقہ کی یاد دلاتے رہتے تھے۔

ایک اور حساس نکتہ کی طرف ہم کو توجہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی و بدی نظام ہستی میں دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مستقل ایک ردہ کو تشکیل دیتی ہے۔ بلکہ خوبیاں عین ہستی اور برائیاں عین نیستی ہیں۔ جہاں سے وجود پیدا ہوتے ہیں وہاں عدم بھی صدق کرتا ہے —— فقر و ناداری، جہل و بیماری یہ چیزیں الگ الگ مستقل وجود نہیں رکھتی ہیں بلکہ فقر وہی ناداری ثروت اور نادانی عدم علم ہے اور بیماری فقدان سلامتی کا نام ہے۔

البتہ علم ایک واقعیت و کمال رکھتا ہے۔ فقر کا مطلب — جیسا کہ گزرا — وہی مال و منال دنیا سے ہاتھ اور جیب کا خالی ہونا ہے۔ پس نہ تو جہل واقعیت ملموس رکھتا ہے اور نہ ہی فقر ایک مردار کے سوا کچھ ہے۔

جب ہم آفتوں، درندوں، مصیبتوں کو بلا اور ناہمواریوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں تو ایک قسم کا فقدان و نیستی درمیان میں ہوتا ہے کیونکہ ان کے بلا ہونے کی وجہ دوسرے موجود میں فنا نیستی و نابودی کا ہونا ہے ورنہ ہر موجود اپنی ذات کے دائرے ہستی سے کسی بھی طرح اس کو نازیبا نہیں کہہ سکتے —— اگر یہ چیزیں اپنے ساتھ بیماری و موت کو نہ رکھتیں اور سبب اتلاف و فقدان ایک رشتۂ ہستی نہ ہوتیں یا رشد و استعداد کی پرورش سے مانع نہ ہوتیں تو بری بھی نہ ہوتیں۔ جو چیز ذاتی طور سے بری ہے وہ، وہ تلفات اور ضایعات ہیں جو ان کی وجہ سے ناشی ہوتے ہیں۔

پس دنیا میں جو بھی موجود ہے وہ خوبی ہے اور بدی از قسم نیستی و عدم ہے اور عدم وجود کی قسم نہیں ہے لہٰذا شر بھی وجود کی قسم سے نہیں ہے۔

وجود و عدم بمنزلہ سورج اور اس کے سایہ کے ہیں جب سورج کسی جسم پر پڑتا ہے تو

اس جسم کا سایہ پڑتا ہے لیکن خود سایہ کیا ہے ! اس کا خود کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔ اس کے موجود نہ ہونے کی علت سوائے سورج کے نہ چمکنے اور اس کا اس پر نہ پڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ورنہ یہ خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔

تمام چیزوں سے چونکہ خلق کا تعلق ہوا ہے لہٰذا ان کا وجود خود ان کے لئے وجود ہے۔ اور ان کا وجود واقعی وجود ہے اور اس لحاظ سے یہ چیزیں شر نہیں ہیں۔ بلکہ فلسفہ الٰہی کے اندر وجود خیر و احسان کا مساوی ہے۔ ہر شی اپنے وجود میں خیر ہے۔ اور اپنے لئے خیر ہے۔ اور اگر یہ شر ہے تو اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے وجود اضافی کے لحاظ سے دوسری چیزوں کی نسبت سے شر ہے۔ اور وجود اضافی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ یہ وجود اعتباری ہے جس سے وجود بالذات متعلق نہیں ہوا ہے۔

بلیریا کے بچھو اور افعی اپنے لئے شر نہیں ہیں ان کو بد اور شر اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کو تکلیف پہونچاتے ہیں اور اس کی موت و ہلاکت کا سبب بنتے ہیں اور جس سے وجود کا تعلق ہوتا ہے وہ وجود اشی النفسہ ہے اور وجود واقعی ہے۔ لیکن جن چیزوں کا وجود اعتباری ہے وہ چونکہ نظام ہستی میں مستقر نہیں ہیں اور واقعی و حقیقی نہیں ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ : خدا نے وجود ہائے اضافی و اعتباری کو کیوں پیدا کیا ؟ کیونکہ امور اعتباری و انتزاعی اپنے ملزومات سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اور ان کا شمار امور حقیقی کے لوازم قہری میں ہوتا ہے اور خود یہ امور وجود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان کی خلقت کے بارے میں بحث بھی نہیں کی جا سکتی۔

موجود واقعی کو خدا ایجاد کرتا ہے اور موجود واقعی اور اس کے صفات بھی حقیقی ہیں کیونکہ ان کا وجود خارج میں بھی ہے — ذہنی وجود سے قطع نظر کر کے — لیکن صفت نسبی و اضافی چونکہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے اس کے ذہن کے علاوہ خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا خالق کون ہے ؟

کائنات کا مطلب ان چیزوں کے علاوہ جن کا وجود امکان پذیر ہے۔ تمام وہ چیزیں ہیں

جو اپنے اوصاف و لوازم غیر تفکیک کے ساتھ ہیں۔ جو بذات خود ایک ایسا واحد ہے جو تجزیہ ناپذیر ہے۔ اور جو چیز حکمت الٰہی کے مقتضیٰ کے مطابق ہے۔ وہ یہ ہے کہ یا تو کائنات کا وجود ایک مستحقق نظام کے تحت ہو یا پھر اصلاً موجود ہی نہ ہو۔

وہ کائنات جو بے نظام ہو یا اسمیں اصول علت و معلول مفقود ہوں یا اس میں خیرات کی شرور و برائیوں سے جدائی ہو۔ ایسی کائنات غیر ممکن ہے اور یہ صرف خیال محال ہے۔ کیونکہ یہ بات محل بحث سے خارج ہے کہ نظام کے ایک جزو سے بحث و کلام متعلق ہو اور دوسرے جزو سے نہ ہو! مجموعۂ آفرینش اسی طرح ایک ہے جس طرح ایک انسان کا پیکر اور اس کے اجزا ایک حکم میں ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے قابل انفکاک نہیں ہوتے۔

پروردگار غنی علی الاطلاق ہے جس کا لازمہ ایجاد اور مخلوق پر فیضان کرنا ہے جیسے کہ ایک سخی بخشش کرتا رہتا ہے جس کے بدلہ میں کوئی جزا یا شکریہ بھی نہیں چاہتا۔ یا جیسے ایک ماہر فنکار ہوتا ہے جو ہمیشہ کسی توقع کے بغیر اپنے فن پارہ کی تخلیق میں مشغول رہتا ہے۔ لہٰذا خلق و ایجاد پروردگار عالم کے اوصاف ذاتی میں ہیں۔

نابرابری

فرض کیجئے ایک کارخانہ کے مالک نے کارخانہ چلانے اور اس سے کسب معاش کے لئے کچھ تو لیبر
سے مزدور سے اور کچھ ماہرین ملازم رکھے۔ اور جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو اس نے بیسروں کو تو
کم تنخواہ دی اور جو فن کار اور ماہر تھے ان کو زیادہ دی تو یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا کارخانہ کے
مالک نے اس طرح تنخواہ تقسیم کر کے مزدوروں پر ظلم کیا یا نہیں ؟ ظاہر سی بات ہے اس قسم کا تفرقہ
کرنا تبعیض و ظلم نہیں ہے۔ یہاں پر عدالت کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ماہرین اور مزدوروں کو برابر
برابر تنخواہ دی جائے۔ بلکہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے لحاظ سے تنخواہ
دی جائے۔ اور اسی طریقہ کار سے کارخانہ ترقی کر سکیگا، ورنہ ترقی کرنا ممکن نہیں ہے! اور
اس قسم کے مواقع پر تفریق عین عدالت ہے اور مساوات ظلم ہے۔

اسی طرح اگر ہم کائنات کو نظر دقیق مطالعہ کریں اور اس کے تمام اطراف و جوانب کو بدقت نظر
مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کے ہر جزء کی ایک خاص وضع ہے اور خاص مقام ہے
اور پھر تحقیق عمیق کے بعد ہم خود ہی احساس کر لیں گے کہ اس کائنات رنگ و بو میں نور کے ساتھ
تاریکی، ظفر و کامیابی کے ساتھ ناکامیابی توازن عام کے لئے ضروری ہے۔ اور جب تک یہ صورت
نہیں ہوگی نظام عام کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

اگر کہیں ایسا ہوتا کہ جہاں تفاوت و اختلاف سے خالی ہوتا تو اس میں تنوع اور
کثرت موجودات کا اثر بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ عالم کی عظمت اسی اختلاف اور تنوع ہی کے اندر
ہے۔ جب تک ہم توازن مجموعہ اور اس کے متقابل رابطہ کو جو تکامل بخش اور منفعت خیز ہے
اپنی نظر میں نہ رکھیں اس وقت تک ہمارا فیصلہ صحیح و منطقی اور موجہ و قابل قبول نہ ہوگا۔ صرف

یک پیکر کے ایک جزئی کو جو ایک مجموعہ سے جدا ہوا ہو دیکھ کر صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

نظام آفرینش توازن اور استحقاق و قابلیت کی بنیاد پر رکھا گیا ہے اور اس نظام ہستی میں جو چیز محقق و ثابت ہے وہ تفاوت ہے نہ تبعیض۔ اور اس ترتیب سے مسئلہ بعینہٖ تر اور مشخص تر ہو جائیگا کیونکہ تبعیض کا مطلب "مساوی استحقاق اور یکساں شرائط کے مواقع پر فرق کیا جانا ہے" اور تفاوت کا مطلب غیر مساوی اور غیر یکساں شرائط میں فرق قرار دینا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط و فاسد ہے کہ کہا جائے ؛ اگر دنیا میں تمام چیزیں یکساں ہوتیں اور ہر قسم کے اختلاف و تفاوت سے دور ہوتیں تو بہت اچھا تھا ؛ کیونکہ حرکت، تکامل، جوش، خروش، عطا، گرفت وغیرہ وغیرہ سب کے سب تفاوت ہی کے زیر سایہ متجلی ہوا کرتی ہیں۔

ہم جس قدر حسن و جمال کا ادراک کر رہے ہیں، یہ ناممکن ہو جاتا اگر اس کے مقابل میں قبیح و بد صورتی نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر زندگی میں فریب، بدکاری وغیرہ نہ ہوتی تو فضیلت و تقویٰ کی اہمیت نہ ہوتی۔ اور ضبط نفس و تہذیب نفس لفظ بے معنی بنکر رہ جاتے۔ اسی طرح اگر فنکار صرف ایک ہی رنگ اپنے فن پاروں میں دیتا تو پھر اسکی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ فنکار کی مہارت کا اظہار ہی لون و رنگ کے تنوع پر ہوا کرتا ہے۔

کسی بھی چیز کے تشخیص کے لئے اس کا دوسری چیزوں سے مختلف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اشیاء اور خود انسانوں کی معرفت ظاہری یا باطنی اختلاف ہی کی بنا پر ہوا کرتی ہے۔

●

خلقت کے دلچسپ ترین باتوں میں مواہب زندگی اور استعداد میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ نظام خلقت نے معاشرہ کے افراد کو ایک مخصوص ذوق دیا ہے جو حیات اجتماعی کے استمرار کے لئے مناسب ہے۔ معاشرہ کی ہر فرد ایک ایک حاجت کو پوری کرتی ہے اور ایک ایک مشکل کا حل نکالتی ہے۔

افراد کی طاقتوں میں فطری تفاوت سب کو سب کا محتاج بنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی

استعداد اور اپنے ذوق کے مطابق معاشرہ کے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان کی ترقی اور اس کا تکامل صرف اجتماعی زندگی کے سایہ ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔

بطور مثال ہوائی جہاز کو لے لیجئے جس میں پیچیدہ آلات بکثرت ہیں اور بڑی باریک بینی سے اسکو ایجاد کیا گیا ہے اس ہوائی جہاز کے اجزا باہم حجم و شکل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکلیہ متفاوت ہیں اور یہ اختلاف اس ہوائی جہاز کے اجزا کے سپرد مختلف اعمال کی وجہ سے ہے اگر ہوائی جہاز کے آلات و اجزا میں یہ اختلاف نہ ہو تو وہ اڑ ہی نہیں سکتا اور پھر یہ ہوائی جہاز نہ ہوتا بلکہ مختلف دھاتوں کا بنا ہوا ایک ڈھانچہ ہوتا اور بس۔

پس اگر ہوائی جہاز کے اندر اختلاف عدل ہے ظلم نہیں ہے تو اس دنیا کے موجودات میں اختلاف خواہ انسان ہو یا کچھ اور وہ بھی عدل باری کے مطابق ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ نظام وجود کے موجودات میں جو تفاوت ہے وہ ان کا ذاتی ہے۔ کیونکہ خدا ہر شئی کو الگ الگ مستقل و منفرد ارادہ سے نہیں خلق کرتا بلکہ پورا عالم ازل سے لیکر ابد تک ــ ایک ارادہ سے پیدا کیا گیا ہے پس جب خدا نے موجودات پر فیضان وجود کیا تو اسی فیضان نے غیر متناہی اشیاء کو ایک ارادہ سے عرصہ کائنات میں ظاہر کر دیا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر موجودات کی آفرینش کے لئے ایک مشخص نظام و قانون ہے جو موجودات کے تمام ابعاد وجود پر سایہ فگن ہے اور کارگاہ نظام علت و معلول میں ہر چیز کا ایک مقام اور معین جگہ ہے۔ آفرینش اشیاء اور تدبیر جہان کے سلسلہ میں ارادہ الٰہی عین ارادہ نظام ہے فلسفی اولہ قاطعہ اس نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید بھی اس واقعیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (القمر)

بیشک ہم نے ہر چیز ایک مقررہ انداز سے پیدا کی ہے اور ہمارا حکم تو بس آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔

دستگاہ الٰہی کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ یہ معاشرہ کے دستگاہ و روابط قرار داد کے

مانند ہے بالکل غلط تصور ہے۔ کیونکہ موجودات کا علاقہ اپنے خالق سے حادث و وضعی علاقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایجاد و خلق کرنیکا علاقہ ہے اور تخلیق کے سلسلہ میں امر الٰہی امر تکوینی حقیقی ہے اور ہر موجود جتنی زیبائی و کمال کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ خدا کی طرف سے اتنا عطا ہوتا ہے ۔

اگر موجودات عالم کے لئے کوئی معین نظام نہ ہوتا تو ہر موجود کے امکان میں یہ بات تھی کہ اس سے ہر شی صادر ہو ۔ اور معلول علت کی جگہ لے لیتی ۔ لیکن ہم کو بطور حتم و جزم موجودات کے درمیان روابط ذاتی کا ادراک کرنا چاہئے اور یہ ادراک کرنا چاہئے کہ اس کے لوازم ذاتی وجود کے کس رتبہ میں ہیں ۔ اور کس خصوصیت پر ہیں ۔ کسی بھی حادث کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مخصوص رتبہ سے تجاوز کر جائے اور دوسرے موجود کے رتبہ میں مشغول ہو جائے ۔ اور تفاوت و اختلاف مراتب ہستی کا لازمہ ہے جو ان کے درمیان شدت و ضعف ، نقص و کمال کے لحاظ سے حکم فرما ہے ۔

خلاف حق تمیز ان دو چیزوں میں تحقق پذیر ہو سکتی ہے جبکہ دونوں میں ایک مخصوص درجہ کمال کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو مگر افاضہ کمال ایک پر ہو اور ایک پر نہ ہو ۔

نظام ہستی میں مراتب موجودات کو انسانی معاشرہ میں مراتب اعتباری سے تشبیہ دینا بھی نا ممکن ہے ۔ کیونکہ مراتب موجودات امور واقعیہ ہیں جو قابل انتقال نہیں ہیں مثلاً حیوان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے وجود کو انسان کے رتبہ میں کرے جس طرح ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم اشخاص کو ان کے مقامات و مناصب سے منتقل کر کے دوسرے مراتب و مقامات پر منتقل کر دیں ۔

اور اسکی وجہ یہ ہے کہ علت کا تعلق جو معلول سے ہوتا ہے یا معلول کا علت سے وہ ذات علت و معلول سے پیدا ہوتا ہے اب اگر کوئی شی علت ہے تو کسی ایسی خصوصیت کی بنا پر ہوگی جو اس ذات سے منفک ہی نہ ہو سکتی ہو ۔ اور معلول بھی کسی خاص وجہ سے

معلول ہوتا ہے جو اسکی ذات میں پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ خصوصیت سوائے اس کیفیت وجود کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس بنا پر تمام موجودات ہستی کے اندر ایک عمیق و ذاتی نظام موجود ہے اور ہر مرتبہ وجود پر اس موجود کا معین ہے۔ اور جب تک تفاوت و اختلاف قصور ذاتی تک محدود ہو اسکو تبعیض نہیں کہتے۔ کیونکہ کسی بھی امر کے تحقق کے لئے صرف فیض خدا کافی نہیں ہوا کرتا بلکہ اسکی ایک بنیادی شرط متعلق میں قابلیت کا ہونا بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض موجودات جس مرتبہ پر ہیں اس سے بلند تر درجہ تک نہیں پہونچ سکے لیکن یہ بات بہرحال محال ہے کہ کوئی موجود قابلیت یا دوسرے کمال کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن خدا اس کمال یا وجود کو روک دے۔

اس کی مثال اعداد جیسی ہے کہ ہر عدد مخصوص جگہ رکھتا ہے۔ دو کا وجود ہمیشہ ایک کے بعد ہی ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ اسکی جگہ بدل دی جائے اور دو کو ایک کے پہلے قرار دیا جائے۔ اور اگر ہم ایک عدد کی جگہ دوسرے کے بعد بدلنا چاہیں تو در حقیقت وہ عدد معدوم ہو جائیگا۔

پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمام حوادث کے لئے معین اسلوب ہیں اور یہ ایک ایسے قوانین کے محکوم ہیں جو ثابت ہیں اور غیر متغیر ہیں ـــــ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آفرینش کے لئے خدا نے کوئی مخصوص قوانین وضع کر دیئے ہیں بلکہ یہ وہی قوانین ہیں جو ہمارے ذہنوں میں مفہوم ہیں اور وجود موجودات کے کیفیت واقعی سے منتزع ہوتے ہیں۔ کیفیت واقعی سے مراد وجود کے مراتب و درجات اور نظام علت و معلول ہے اور وہ شی مراد ہے کہ امور اس نظام کے باہر نہیں جریان پیدا کر سکتے اور یہی سنت اللہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے:۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (فاطر/۴۳)

پس نتیجہ یہ ہوا کہ قوانین ذاتیہ کا ایک سلسلہ ہے جس پر نظام ہستی کی بنیاد رکھی گئی ہے جس میں ہر موجود کی جگہ اور موقعیت مشخص ہے اور ہستی کے لئے وجود و درجات و مراتب گوناگون و نظام وجود کے بقا کے لوازم میں سے ہے۔ اور یہ قہری طور پر موجودات کے

درمیان تفاوت و اختلاف کے ظہور کا موجب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف و تفاوت بذاتہ مخلوق نہیں ہیں بلکہ حادثات کے لوازم میں سے ہیں۔ اور اس دنیا کے ہر جزء نے جس جگہ کے لائق تھا وہ اس نے لے لیا اور اس مجموعہ وجودیہ کے کمال کے لئے جو ایک جدول ضرب کی طرح ہے بعض اجزاء کے ساتھ بے عدالتی و تبعیض روا نہیں رکھی گئی۔

جو شخص مادی عقل رکھتا ہے اور نظام طبیعت میں اختلاف و تفاوت کو ستم و بے عدالتی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پوری کائنات پر عدالت کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کے لئے زندگی بڑی تلخ و ناگوار ہے اور اس کا یہ جلد بازی کا فیصلہ اس بچے کے فیصلہ کی طرح ہے جو موسم بہار میں باغبان کو ہرے بھرے درختوں کی شاخوں کو کاٹتے ہوئے دیکھ کر فوراً فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ باغبان ناداں و ویران گر ہے کیونکہ اسکی نظر میں اسکی حکمت نہیں ہے۔

اگر ایسے شخص کے اختیار میں تمام مواہب دنیا دیئے جائیں جب بھی یہ راضی نہیں ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں دنیا بے مقصد ہے اور آفرینش کی بنیاد ستمگری پر رکھی گئی ہے پھر ان کی خواہش عدالت پوچ و بے معنی ہے کیونکہ ایک ایسی دنیا میں جو بے مقصد ہو کوئی ہدف رکھنا بیہودہ سی بات ہے

اگر بقول مادیوں کے انسان کی بازگشت مثل گھاس پھوس کے ہے جو خود بخود کائنات میں اگتی ہے اور پھر فنا ہو جاتی ہے تو انسان سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسے عالم میں رہ رہا ہے جو نہ اس کے مناسب ہے نہ موافق بلکہ قوت فکر و احساس اس کے لئے پریشانیوں کی ابتدا ہے اور اس کے ساتھ یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ بدبختی و رنج اس کے لئے اضافہ کرتے ہیں اور باعث زیادتی عذاب بھی ہے۔

اگر انسان بڑی محنت و ہمت سے بشریت کی کوئی خدمت انجام دے اور بڑی مخلصانہ خدمت نوع انسانی کے لئے کرے تو اس کو کیا فائدہ؟ کیونکہ اس کی یاد چاہے حقیقی احترام و تقدیر سے منائی جائے یا اس کی قبر پہ کوئی یادگار بنا دی جائے یا اس کے نام پر کچھ مراسم کئے جائیں تو اسکو تو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ملے گا اور ایک پوچ و ہیچ افسانہ سے زیادہ اسکی قدر و قیمت

نہ ہوگی کیونکہ — مادی حضرات کی نظر میں — فطرت نے ایک پیکر بنایا تھا، چند دنوں اس سے بازی کی اور اس کو نچاتی رہی اور پھر دوبارہ اسکو ایک مشت خاک بنا دیا۔

اگر ہم بیشتر ایسے لوگوں کے انجام پر غور کریں جنھوں نے بڑے بڑے رنج و غم برداشت کئے ہیں پریشانیوں اور بدنصیبی سے دوچار ہوئے ہیں تو پھر ہمارے سامنے ایک بڑا دردناک اور تکلیف دہ منظر ہوگا۔

انسانوں کا یہ حشر دیکھ کر کیا مادیوں کی جنت عذاب جہنم کے علاوہ اور کچھ ہوگی؟

اور انسانیت کی بدبختی اس وقت اوج کمال پر پہونچ جاتی ہے جب ہم مادیوں کا یہ نظریہ پڑھتے ہیں کہ انسان تو مجبور محض ہے اسکے پاس نہ ارادہ ہے نہ اختیار — اس نظریہ کی بنا پر انسان ایک آٹومیٹک مشین کی طرح ہے کہ فطرت از روی میکانزم[۱] و ڈائنامیزم[۲] اس کے علاوہ بھی عمل کرتی ہے۔ اب بتائیے کیا عقل و فطرت اور حقائق حیات انسانیت اور اس کے انجام کی یہ تفسیر قبول کریں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔

اور اگر قبول کرلیں تو پھر انسان اس گڑیا سے زیادہ نیک بخت نہیں ہے جو بچوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ آیا انسان کے لئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ انسانی و اخلاقی اصول اور ملاک ارزش کو صرف شخصی سود و زیاں اور اپنے جنسی رجحانات سے توجیہ نہ کرے؟ اور امکانی حد تک ہر رکاوٹ کو دور کرے اور پائے ہوس سے ہر زنجیر کو توڑ کر الگ نہ کر دے؟ — یقیناً مادی نظریہ سے تو یہ بہتر ہی ہوگا — اور اگر اس کے علاوہ عمل کرے تو بے عقل و نادان و پسماندہ نہیں ہے؟ بھلا جو شخص بھی بصیرت و بینش صحیح کا دارا ہوگا اور غیر طرفدار ہو کر، اغراض و جبلیات سے ہٹ کر دقت نظر کے ساتھ فیصلہ کے لئے بیٹھے گا وہ اس قسم کی کوتاہ نظری و تخیل — چاہے وہ کتنا ہی سفسطہ آمیز فلسفی و علمی دلائل سے آراستہ ہو — کی ارزش و اعتبار کا قائل ہوگا؟

۱؎ مثلاً سادہ چیز سے، ترکیب چیز سے۔

۲؎ وہ آئین جو عناصر مادی میں فطرتاً شامل بالقوہ ہیں۔

لیکن مذہبی اعتبار سے شخص مومن عالم کو ایک نظام خود آگاہ و دارای ارادہ و احساس و با مقصد سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہی حکمت عظیم اور عادل تمام ذرات وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے اعمال و افعال کی بھی ناظر ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ اس حکیم حاکم کے سامنے جو پوری کائنات پر محیط ہے ہم کو جوابدہ ہونا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے۔ جہانِ الٰہی، جہان وحدت و ہم آہنگی وغیرہ ہے اور تضاد و شر کا وجود ضمنی و تبعی ہے۔

اور دوسری طرف مذہبی نظریہ انسانی حیات کے لئے ایک وسیع افق کا تصور پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حیات انسانی کا انحصار صرف دنیا ہی میں نہیں ہے اور نہ زندگانی دنیا کا مطلب یہ ہے کہ انسان عیش و آرام میں ہر رنج و غم سے دور ہو کر زندگی بسر کرے۔ وہ تو یہ بتاتا ہے کہ دنیا ایک گزرگاہ ہے اور آخرت کی زندگی تک پہونچنے کا ایک پل ہے۔ یہ دنیا تو امتحان، سعی مسلسل عمل پیہم کا ایک میدان ہے جس میں ایمان کی درستگی اور کردار کی شائستگی کی آزمائش ہوتی ہے لیکن آخرت کی ابتدائی زندگی ہی میں دقیق ترین میزان موجود ہے جس پر انسان کے افکار و عقاید اعمال کی اچھائی و برائی تولی جاتی ہے۔ اور وہاں پر عدالت الٰہی کی حقیقی صورت متجلی ہوتی ہے اور دنیا میں مادی و معنوی عقب ماندگی اور ہر قسم کی محرومیت کا بہترین طریقے سے جبران کیا جاتا ہے۔

متاع مادی و دنیوی کی ماہیت کی یہ بدصورتی اور ابتذال دیکھ کر انسان کی آگاہانہ حرکت صرف خدا کی طرف ہوتی ہے۔ اور پھر اس کا پورا وجود و مقصد خدا کے لئے زندہ رہنا اور اسی کے لئے مرنا ہو جاتا ہے۔ اور پھر تو اس کے بعد دنیا کی پستی و بلندی کی اسکی نظر میں کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ تمام امور کو واقعیت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور کسی بھی جمال سے دلبستگی نہیں پیدا ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس جمال کے سامنے سرنگوں ہو گیا تو یہ جمال اس کے منابع انسانیت کے سوتوں کو خشک کر دے گا اور اس کو حضیض گمراہی کے کنویں میں ڈھکیل دے گا۔

ایک دوسری بات بھی سمجھ لیجئے کہ اگر مسئلہ استحقاق مطرح نہیں ہے تو تفاوت و اختلاف

کی وجہ سے کوئی ظلم متحقق نہیں ہوگا۔ کیونکہ ظلم کا تحقق اس صورت میں ہوا کرتا ہے جب کسی کے حق کی تبعیض ہو رہی ہو حالانکہ وہ استحقاق میں برابر ہے۔ لیکن موجودات عالم کبھی بھی خدا پر کوئی حق نہیں رکھتے اور نہ کسی دن کسی چیز کے مستحق تھے اگر ایسا ہوتا تو بعض کو بعض پر برتری دینے میں ظلم ہوتا۔

ہم تو اپنے نفس کے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، ہماری سانس کی آمد و رفت، دل کی دھڑکنیں، غور و فکر ایک ایسے سرمایہ سے حاصل ہوتے ہیں جس کے ہم مالک نہیں ہیں اور اسکے مہیا کرنے میں کوئی زحمت نہیں کی ہے اور وہ سرمایہ پروردگار عالم کا وہ ہدیہ ہے جو اس نے ابتدائے ولادت سے ہم کو بخشا ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہمارے پاس جو بھی ہے وہ سب عطیہ الٰہی ہے تو ایسے مقام پر تفاوت جو با حکمت پر ہے نہ ظلم ہے نہ عدل ہے کیونکہ اس کے پہلے کوئی استحقاق ہی نہیں تھا۔ یہ محدود و موقت زندگی خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے وہ اس ہدیہ کے میزان اور نوع کو معین کرنے میں کاملاً اختیار رکھتا ہے اور آزاد ہے۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہے لہٰذا ہم کو حق اعتراض بھی نہیں ہے چاہے وہ مفت دیا ہوا عطیہ کتنا ہی تھوڑا اور مختصر ہو۔

ے اس کی تفصیل ماقبل کے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

مسئلہ جبر و اختیار

اصل موضوع پر ایک نظر

مسئلہ جبر و اختیار ان مسائل میں سے ہے جس نے طبیعت وشئون انسان سے سروکار رکھنے والے مفکرین کی نظر کو اپنی طرف ہمیشہ متوجہ کیا ہے۔ اور یہ مختلف عقائد و نظریات کے مابین ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہمیشہ سے بنا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا انسان اپنے امور حیات مادی و معنوی میں، اختیار، مقاصد و اہداف میں اپنے مساعی اور اعمال میں آزاد و خود مختار ہے اس کے شخصی ارادہ کے علاوہ ان چیزوں میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے؟ یا انسان اپنے سلوک و عمل میں مجبور ہے اور کسی بھی عمل کے کرنے اور عزم محکم میں وہ شل آلہ کے دوسرے عوامل کا محتاج ہے اور اسکو انہی پر عوامل دیگر نے مجبور کر دیا ہے؟

اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ علوم اقتصادی حقوقی، مذہبی، روحانی اور دیگر وہ تمام علوم جو موضوع انسان سے مربوط ہیں۔ ان سے یقینا فائدہ اٹھایا جائیگا اس معمہ کے چہرے سے نقاب آتنی ہی اٹھتی چلی جائے گی۔

مسئلہ حریت و اختیار کو موضوع بحث بنانا محض علمی و فلسفی مباحث میں منحصر نہیں۔ بلکہ عملاً یہ مسئلہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جو انسانی وظیفہ کو بیان کرتے ہیں اور انسان کو اسی بات کا مسئول سمجھتے ہیں کہ وہ اس وظیفہ کا اجراء کریں، اور لوگوں کو عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر حریت و آزادی کے معنی طور پر بھی معتقد نہ ہوں گے تو ثواب و عقاب کا مسئلہ بے معنی ہو جائے گا۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ اسلامی فکر کا بھی تقاضا یہی تھا کہ اس مسئلہ میں بہت ہی دقت نظر سے کام لیا جائے۔

اور توحید کے بعد علماء نے اسی مسئلہ کو مورد توجہ قرار دیا ۔ اس کی بنیادی باتوں، گہرے مسائل، مبہم و تاریک نقاط کو روشن کیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ جہاں ایک طرف توحید سے مرتبط ہے وہاں دوسری طرف عدالت اور قدرت الٰہی سے بھی اس کا رابطہ ہے۔

متکلمین کے ـــــ خواہ ماضی کے ہوں یا دور حاضر کے ـــــ اس مسئلہ میں دو گروہ ہیں :-

۱۔ ایک گروہ انسان کی اعمال کے اندر آزادی کو بالکلیہ تسلیم نہیں کرتا ۔ اور اس کا کہنا ہے کہ جو اعمال و مساعی بظاہر ہمارے ارادہ و اختیار کے تحت نظر آتے ہیں اس میں انسان کے ادراک کا نقص اور اس کے سمجھ کی کوتاہی ہے ۔

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے : انسان با اختیار ہے اس گروہ کا کہنا ہے کہ انسان اپنے امور و اعمال میں حریت کاملہ رکھتا ہے اور اس کے ارادہ کی شعاع بہت وسیع ہے نہ اس کا کوئی مانع ہے نہ رادع ۔

ایک طرف انسان خود اپنے وجود میں اپنی پیدائش سے پہلے ان عوامل کے پیش نظر جو اسکو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جبر کو محسوس کرتا ہے ۔ اور اسی طرح جب وہ بعض حوادث حیات سے دوچار ہوتا ہے تب بھی جبر کو محسوس کرتا ہے۔ بلکہ انسان یہاں تک سوچنے لگتا ہے کہ اسکو تو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی آزادی حاصل ہے ۔ کیونکہ وہ اس زندگی میں جب داخل ہوتا ہے تو اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا میں آکر ایک جبری نظام کے ماتحت ہوتا ہے ۔ بلکہ وہ دنیا میں ایک ایسے کاغذ کے ورق کی طرح ہوتا ہے جو ہوا کے رحم وکرم پر ہو۔ اور پھر اس دنیا سے رخصت ہونے میں بھی جبر محسوس کرتا ہے ۔

اور دوسری طرف یہی انسان بہت سے امور میں اپنی حریت و استقلال کو محسوس کرتا ہے ۔ جہاں نہ کوئی جبر ہوتا ہے نہ اکراہ ـــــ وہ مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتا ہے ۔

اپنے سابق تجربات کی روشنی میں اپنے تسلط کو فطرت پر وسیع کرسکتا ہے ۔ کسی بھی مسلک کا آدمی اس واقعیت عملی و عینی کا انکار نہیں کرسکتا کہ ہاتھوں اور پاؤں کی حرکت انسان کے اپنے ارادہ کے تابع ہے مگر دل کی دھڑکن اس کے اختیار سے باہر ہے ۔ اسی طرح جگر و پھیپھڑے کے عمل میں تفاوت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا ۔

پس انسان اپنے ارادہ و اختیار اور اس کے نفوذ میں — جو رمز انسانیت بھی ہے اور اساس مسئولیت بھی — یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے کچھ اعمال و افعال میں آزاد و خود مختار ہے اور اپنے ارادہ و اختیار کے استعمال میں دور دور تک جبر محسوس نہیں کرتا ۔ اور یہی انسان بعض دوسرے مادی اور غریزی امور میں اپنے کو دست بستہ اور مجبور پاتا ہے اور اس کی زندگی میں اس قسم کے مسائل کی کمی نہیں ہے ۔

جبر کے قائل حضرات

جبری لوگ انسان کو اپنے اعمال میں مجبور محض سمجھتے ہیں ــ اشعری حضرات ــ وہ مسلمان جو ابوالحسن اشعری کی رائے کے پابند ہیں ــ اسی قول کو تسلیم کرتے ہیں تمام آیات و احادیث میں غور و فکر کئے بغیر بعض آیات کے ظاہری معنی کو اپنا مدرک و مستند قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں اور کائنات رنگ و بو میں کسی علت و سبب کے قائل نہیں ہیں ان کے عقیدہ میں تمام حوادث ڈائرکیٹ بغیر کسی واسطے کے خدا کے معلول ہیں ــ یہ حضرات کہتے ہیں کہ انسان کے پاس اگرچہ قدرت و ارادہ دونوں ہیں۔ مگر انسانی افعال میں ان دونوں کا کوئی اثر یا دخل نہیں ہے۔ کیونکہ ارادہ و قدرت معلول عمل کی علت نہیں ہیں بلکہ موثر در حقیقت ارادۂ الٰہی ہے۔ انسان تو اس عمل کو اپنے قصد و ارادہ سے ایک رنگ دے سکتا ہے اور بس۔ اور یہی ارادہ اس عمل کو یا تو عمل صالح یا عمل غیر صالح کی فہرست میں درج کرتا ہے۔ اس بنا پر انسان صرف ایک آلہ و ہتھیار ہے جس کو قدرت جس طرح چاہتی ہے استعمال کرتی ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم انسان کو صاحب قدرت و اختیار مان لیں تو خدا کی حکومت و قدرت کا دائرہ محدود ماننا پڑے گا۔ حالانکہ خدا کی خالقیت مطلقہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں کسی بھی فرد انسان کے لئے قدرت کے قائل نہ ہوں خدا کی حاکمیت مطلقہ اور توحید کا تقاضا یہی ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ تمام حوادث وجود یہاں تک کہ خود انسان کے اعمال خدا کی مرضی کے بغیر موجود ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر ہم یہ قائل ہو جائیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے تو گویا ہم نے تمام عالم وجود پر خدا کی حاکمیت مطلقہ

کا انکار کر دیا۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حریت ارادہ کا عقیدہ شرک باللہ تک منجر ہوتا ہے۔

یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام حوادث عالم کا ظہور علل متقدمہ کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ سلسلِ علتین ایک اصلی اور انتہائی علت تک پہونچتی ہیں اور وہ علت اصلی خدا ہے۔

اور انسان جو اپنے کو بظاہر حر اور آزاد سمجھتا ہے اس کی حیثیت ایک بے ارادہ آلہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور عقل و غرائز و عواطف و احساسات سے لیکر غیر مرئی امواج اور کیمیاوی عناصر کے تاثیرات، اور پانی، ہوا، خاک کا اثر، معاشرہ، تربیت، وراثت کے عوامل اور ان کے علاوہ دوسرے عوامل یہ سب کے سب انسان کے حدود اختیار سے خارج ہیں۔ اور درحقیقت انسان بیرونی اور اندرونی عوامل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جن سے اسکو آزادی مطلق ناممکن ہے۔

کچھ لوگوں نے — دانستہ یا نادانستہ — دین و اخلاق کے خلاف اعمال بجالانے کی وجہ سے عذر تراشی اور اپنی برأت کے لئے مسئلہ جبر کو قبول کر کے عقیدہ و عمل میں انحراف کے لئے ایک راہ تلاش کی ہے اور اپنے فساد و تباہ کاریوں کے لئے اس مسئلہ کو بطور دستاویز استعمال کیا ہے۔ کچھ ایسے شعراء بھی گزرے ہیں کہ عقیدہ جبر کو قبول کر کے اپنے گناہوں کے لئے جواز مہیا کر لیا ہے۔ اور بزعم خود وجدانی فشار اور بدنامی سے بچ گئے ہیں۔

جبریوں کا یہ طرز فکر عدالت الٰہی اور عدالت اجتماعی دونوں کے خلاف ہے۔ جبکہ ہم عدل الٰہی کو اپنے تمام ابعاد کے ساتھ نظام وجود میں وسیع صورت میں موجود پاتے ہیں اور خدا کی اسی صفت سے توصیف کرتے ہیں چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران ۱۸)

خدا نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تمام فرشتوں نے اور صاحبان علم (انبیاء و ائمہ) جو عدل پر قائم ہیں دیہی شہادت دی

کہ اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی (ہر چیز پر) غالب اور دانا ہے۔

اسی طرح خدا نے استقرار عدل کو انسانی معاشرہ میں بعثت رسل اور ارسال کتب کی غایت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید/۲۵)

ہم نے یقینا اپنے پیغمبروں کو واضح اور روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن خدا اپنے بندوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (انبیاء/۴۷)

اور قیامت کے دن تو ہم (بندوں کے بھلے برے اعمال تولنے کے لئے) انصاف کی ترازوئیں کھڑی کر دیں گے۔ اور پھر تو کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

ذرا سوچئے تو کیا یہ انصاف ہے کہ ہم کسی شخص کو جرم پر مجبور کر کے سزا دیں؟ یقینا ایسا کرنا صریحی ظلم ہے اور اصول عدالت سے بعید ہے اور اگر ہم اصل آزادی کا انکار کر دیں اور کسی بھی مثبت نقش کو انسانی ارادہ کے لئے ثابت نہ مانیں تو انسان اور دیگر موجودات میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہے گا۔ جس طرح دیگر موجودات کی دائمی حرکتیں ایک غیر اختیاری سلسلۂ علل کی معلول ہیں۔ عقیدہ جبر کی بنا پر ہمارے اعمال و حرکات بھی اسی عنوان کے ہو جائیں گے۔

اور اگر خدا ہی انسان کے اختیاری اعمال کا خالق ہے اور وہی انسان کے اندر ظلم و فساد بھی خلق کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے ساتھ شرک بھی وہی کرتا ہے تو پھر اس ذات مقدسہ

کی تشریح کیونکر کریں گے ؟

جبر کا قول ماننے سے نبوت، وحی، الہام، اوامر، نواہی، احکام شرعیہ، بیانات عقائدیہ، ثواب، عقاب کا لغو ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب ہم یہ مان لیں گے کہ لوگوں کے افعال ان کے ارادوں کے بغیر آٹو میٹک طریقہ سے ہو جاتے ہیں تو پھر انبیاء و مرسلین کو جو عقول بشر کی مدد کے لئے بھیجا گیا ہے وہ کیا ہے ؟ — جیسا کہ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ انبیاءؑ و رسل کی بعثت عقول بشر کی مدد کے لئے کی گئی ہے۔

اور جب تکالیف شرعیہ اور دستور آسمانی انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں تو پھر انسان کو مکلف بنانے کی کیا توجیہ ہوگی ؟ اور اسی طرح جب جبری کا فرمانا ہے تو انسان کا سلوک بلکہ اسکی روحیات جو آٹو میٹک طریقے سے انسان سے سرزد ہوتی ہیں، اور معاشرہ و افراد کو فضیلت و اخلاق وغیرہ پر آمادہ کرنے کی ساری کوششیں رائیگاں ہو جائیں گی تو پھر ان کوششوں اور زحمتوں سے کیا حاصل ؟ کیونکہ اس مقصد کی کوشش بے نتیجہ رہے گی اور ایک مجبور سے تربیت و تغییر کا انتظار بھی بیکار ہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انحطاط و سقوط کے بارے میں خود انسان مسئول ہے اور اپنے کو اور دوسروں کو نجات دلانے کا مکلف بھی ہے۔ اور اس کا اختیار ہی اس کے مقدر کو مقرر کرتا ہے اور وہ بڑی ہی دقت نظر سے اپنے طریقہ کار کا انتخاب کرتا ہے اور خدا کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتا ہے تب خدا اپنی قدرت و نور کے ذریعہ اس کو توفیق بخشتا ہے۔

مشہور فلسفی سینت ھیلر — SAINT HELLER — کہتا ہے : جس ذات نے ان عوالم اور قوانین وجود کو خلق کیا ہے اس نے عظمت و حریت کے لحاظ سے قلب جیسی چیز نہیں خلق کی ہے۔ یہ قلب — بہت چھوٹا ہونے کے باوجود — تمام طبیعت سے بڑا ہے بلکہ جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی وہ عالم طبیعت و فطرت کے کسی بھی چیز سے اس کا قیاس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تعالیٰ بہت ہی باریک ہے۔ کیونکہ مقام معنوی کی عظمت کسی بھی

دوسری عظمت سے قابل قیاس نہیں ہے۔

عالم طبیعت کے حوادث سے زیادہ واضح اور روشن خدا کی قدرت ہمارے نفوس کے اندر ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور اندرونی سسٹم سے ایک دوسرا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان جب خود باطنی طور سے عقل کی اطاعت یا معصیت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ اپنے اندر یہ احساس بھی پاتا ہے کہ ایک قادر مطلق کے سامنے اپنے کرداروں کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔

انسان کے لئے یہ سزاوار ہے کہ جب وہ قانون خداوندی کی مخالفت کرے جس کی عدالت کا اعتراف بھی رکھتا ہے تو اس کے غضب سے ڈرتا رہے۔ اگر انسان خود اپنی خطا پر غضبناک ہے تو اسکو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ جس نے قانون بنایا ہے وہ بھی اجتناب کے امکان کے باوجود خطا کرنے والے پر غضبناک ہوگا۔

جو شخص اس زندگی میں قانون اخلاق سے لذت محسوس کرتا ہو۔ اسے خود چاہئے کہ اس لذت کا حساب بیباق کر دے۔ کیونکہ معاشرہ افراد کا محاسبہ اس لئے نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ان گناہوں پر عقاب کرتا ہے جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوں۔ اور معاشرہ کے افراد بھی گنہگار کی طرح داوری نہیں کر سکتے کیونکہ انسان کی نیت اور دلوں کے بھید سے نہ معاشرہ واقف ہے نہ افراد معاشرہ لیکن نیت، مقصد یا جو چیز بھی عدالت اجتماعی سے مخفی ہو وہ بہر حال مورد حکم تو ہے اس لئے فرد ہی کو چاہئے کہ محاسبہ کرے۔

اب یہاں پر دو ہی صورتیں ہیں۔ ۱۔ قانون اخلاق کی برتری، انسانی حریت اور مسئولیت کا انکار کر دیں۔ ۲۔ اس زندگی کے علاوہ ایک دوسری زندگی کو مانیں جہاں خدا اپنی عدالت کے مطابق لازمی طور پر فیصلہ کرے گا۔ اور اگر قانون اخلاق اس بات کو تسلیم کرے کہ عالم آخرت میں ایک آخری عدالت کا وجود بہر حال ہے تو اس نے اپنے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔[1]

---

[1] مقدمہ علم الاخلاق ص ۲۰۱

اعتراض وجواب

جبری حضرات یہ بھی کہتے ہیں: خدا ازل سے لیکر ابد تک کے سارے واقع ہونے والے واقعات وحوادث کا خواہ وہ کلی ہوں یا جزئی علم رکھتا ہے اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی حادثہ ہو خواہ وہ جزئی ہو یا کلی۔ اس کا علم خدا کو ازل ہی سے ہے۔ لہٰذا ان تمام سیئات اور گناہوں کا متعلق افراد سے معمولی تغیر کے بغیر سرزد ہونا ضروری ہے اور انسان کسی بھی طرح ان کے ترک پر قادر نہیں ہے۔ ورنہ علم خدا جہل ہو جائیگا۔ بقول خیام گر مے نخورم علم خدا جہل شود (ترجمہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یقیناً درست ہے کہ کائنات کے اندر ہونے والے تمام واقعات کا علم خدا کو پہلے سے ہے۔ لیکن اس علم کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مجبور ہے کیونکہ علم خدا علت ومعلول کے بنیادی نظام پر قائم ہے حوادث سے اس کا تعلق نہیں اور لوگوں کے اعمال سبب ومسبب کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ اور جو علم علت ومعلول کے سلسلہ جاری سے متعلق ہوتا ہے وہ جبر واکراہ کا موجب نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ جو خدا عالم میں آئندہ ہونے والے جریان سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ افراد انسان اپنے ارادہ واختیار سے اعمال بجا لائینگے اور افراد بشر کا اپنے ارادہ واختیار میں آزاد ہونا سلسلہ اسباب ومسببات اور علل ومعلولات کا ایک جز ہے اور خود انسان نیک وبد عمل کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے سوء اختیار کی وجہ سے فساد وگمراہی کا سبب بنتا ہے۔ اب اگر کسی معاشرہ میں باطل اور ظلم کا دور دورہ ہو جائے تو یہ خود لوگوں کی وجہ سے ہوگا۔ اسمیں خدا کا ارادہ دخیل نہیں ہوگا اور علم الٰہی بندوں کے فعل خیر یا شر کے اختیار کرنے میں موثر نہیں ہوتا۔

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی آزادی وانتخاب میں احوال محیط، کشش ہائے فطری، ہدایت الٰہی بطور عوامل تھوڑا بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اثر انداز ہونے کا مطلب صرف ایجاد تمایل اور راہ کشائی ہے۔ اور ارادہ انسان کے لئے شوق انگیز ہے۔ لیکن ایجاد جبر واکراہ نہیں کرتے اور ان امور کے وجود کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان ان امور کے چنگل میں گرفتار

ہے۔ بلکہ وہ ان تمایلات کی پیروی یا مخالفت میں اور ان کے محدود کرنے اور تغییر مسیر میں کاملاً آزاد ہے۔ اور خود انسان اپنی بصیرت و روشن بینی سے اسکی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ آدمی کے طبعی جوش مارتے ہوئے جذبات کے چشموں کو نہ بالکل خشک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو بے مہار چھوڑا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک ماہر مکینک ایک کار کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ فنی خرابی کی بنا پر چند کیلو میٹر چلنے کے بعد رک جائے گی۔ اور واقعاً وہ کار چند کیلو میٹر کے بعد رک جائے تو کار کے رکنے کا سبب فنی نقص ہے یا مکینک کا علم؟ یعنی چونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کار چند کیلو میٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد رک جائے گی اس کے اس علم کی وجہ سے کار رک گئی۔ ظاہر ہے کہ جواب یہی ملے گا کہ فنی نقص کی وجہ سے رکی ہے۔ مکینک کا خبر دینا یا اس کا علم سابق اس کی علت ہرگز نہیں ہے اور نہ کوئی عقلمند مکینک کے علم سابق کو علت بتا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک مدرس جو اپنے درجے کے تمام طلاب سے واقف ہے وہ ایک طالب علم کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ پڑھتا نہیں ہے۔ کام چور ہے، کاہل ہے سالانہ امتحان میں فیل ہو جائیگا۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آیا تو وہ طالب علم فیل تھا تو کیا اس کے فیل ہونے کی علت استاد کا علم تھا یا اس کا نہ پڑھنا محنت نہ کرنا تھا؟ ظاہر ہے علم مدرس کو علت نہیں کہا جا سکتا اس کی علت تو صرف طالب علم کی کاہلی اور نہ پڑھنا ہے۔ اسی طرح اگر خدا بندوں کے افعال کو جانتا ہے تو اس کا علم افعال عباد کی علت نہیں ہے۔ اور اتنی بات اس موضوع کے لئے کافی ہے۔

عقیدہ جبر کا معاشرہ پر ایک منحوس اثر یہ بھی ہوا ہے کہ اس عقیدہ نے سرکش و ظالم لوگوں کو مظلوموں پر ظلم کرنے کا جواز پیش کر دیا ہے اور مظلوموں کے ہاتھوں کو اپنا دفاع کرنے سے بھی روک دیا ہے!

مسئلہ جبر کو بہانہ بنا کر ظالم اپنے بے رحمانہ اور ظالمانہ افعال کی مسئولیت سے اپنے کو بری

کہ کر بری کر لیتا ہے کہ ظلم میں نے نہیں کیا یہ تو خدا نے کیا ہے وہ اپنے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ اور اپنے ظلم کو خدا کی طرف نسبت دیتا ہے کہ میں ہرگز ہرگز سزاوار طعن و اعتراض نہیں ہوں یہ سب خدا نے کیا ہے ۔ اور مظلوم کو ظالم کا ظلم برداشت ہی کرنا پڑیگا کیونکہ ظلم و بیدادگری کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ جس نے اس پر ظلم کیا ہے — یعنی خدا — وہ مظلوم کو بل نہیں سکتا کہ اس سے انتقام لے لہٰذا بجز ظلم کو خاموشی سے برداشت کرے ۔

البتہ مکتب مادی کے پیروکار اس مسئلہ — مسئلہ جبر و اختیار — میں فکری تناقض کے اندر مبتلا ہیں ۔ یہ لوگ ایک طرف تو انسان کو موجود مادی مانتے ہیں اور تعلیمات ڈیالیکٹک کا محکوم مانتے ہیں ۔ یعنی انسان عوامل محیط و جبر تاریخ اور پہلے سے معین شدہ اوضاع کے سامنے ایک غیر موثر عامل ہے اور فاقد الارادہ ہے اپنے اعمال کے اختیار کیا بلکہ اپنے افکار و نہج حیات میں بھی تعبیر طبیعت و فطرت ہے ۔ ان لوگوں کا کہنا ہے : کوئی بھی حرکت و تطور یا اجتماعی انقلاب جو وہ محیط و ماحول کے اوضاع مادیہ کا طبعی نتیجہ ہوا کرتا ہے اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا کیونکہ انسان کا — کوئی ذاتی ارادہ نہیں ہے — ارادہ معاشرہ و ماحول کے اقتصادی و مادی اوضاع کا تابع ہوتا ہے ۔ بلکہ ارادہ تو درکنار انسان کا ذہن حرکت تاریخ کے جبری سیر کے قہری قوانین کا تابع و محکوم ہوتا ہے ۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہی طریقہ اختیار کرے جس کو معاشرہ کے مقتضیات اور فکری تصورات نے اس کے لئے معین کر دیا ہے ۔ لہٰذا انسان کے سامنے اپنے ارادہ و اختیار کے اظہار کا راستہ بالکل بند ہے ۔ اور نہ ہی اس کے اپنی مسئولیات کی معرفت کا کوئی رول ہے ۔

— یعنی خلاصہ یہ ہوا کہ انسان معاشرہ و ماحول سے مجبور ہے فاقد الارادہ ہے ۔ مترجم

اور دوسری طرف یہ لوگ کہتے ہیں : نظام معاشرہ میں افراد انسان کی شخصیت بہت ہی موثر ہے اور اسی لئے یہ لوگ انضباط مسلکی و حزبی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور استعمار زدہ تنظیموں کو بغاوت مسلحانہ پر آمادہ کرتے ہیں ۔ اور لوگوں کے اختیار و حریت کا فائدہ اٹھا کر ظلم لتا

کے عقاید میں تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور خود توجہ کرتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ اور ان کا انسان کے لئے بلکہ فرد کے لئے اعتراف کرنا مادیہ ڈیالکٹیک کے ساتھ صریح تناقض ہے۔ یہ گویا اعتراف واقرار ہے کہ قوت واختیار افراد انسانی تک کے پاس موجود ہے معاشرہ میں تو محل بحث ہی نہیں ہے۔

اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ مظلوم جمہور کو حرکت میں لانا اور ان کی انقلابی تحریکوں کو تقویت پہونچانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ رجعت پسند و کہنہ طلب قدیم کے بطن سے نظام جدید کے سوبچے کو نکالا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام غیر منطقی ہے کیونکہ تحول کیفی اور انقلاب اپنے حدود سے خارج دبے موقع نہیں ہو سکتا اور طبیعت ہر شخص سے بہتر اپنے کام کو ڈیالکٹیکی رول کے مطابق انجام دے لے گی۔ اور افکار کی تبلیغ و تحریک درحقیقت طبیعت کے کاموں میں بے جا مداخلت ہے۔

یہ کہنا کہ آزادی کا مطلب ادراک ضرورت و قوانین طبیعت کی شناخت اور اہداف و مقاصد معینہ کے حصول کے لئے ان چیزوں سے امکان استفادہ ہے۔ نہ یہ کہ قوانین طبیعت سے مقابلہ و مقاومت ہے۔ تو اس سے بھی اشکال وابہام دور نہیں ہوتا۔ کیونکہ شناخت قوانین اور ان سے اہداف معینہ میں استفادہ کے بعد بھی یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ مادہ و طبیعت ان مقاصد کو معین کرتی ہے یا خود انسان ان کا معین ہوتا ہے؟ اور اگر یہ انسان ہے جو تعیین کرتا ہے تو کیا اس کے تعیینات اس کی خواہشات و شرایط طبیعت کی تصویر ہیں یا ان کے جریان کے برخلاف بھی امکان پذیر ہیں؟

مادی حضرات کا خیال ہے کہ انسان ایک موجود مادی ہے بلکہ اس کے عقائد و افکار بھی تحولات اقتصادی و مادی کا نتیجہ ہوتے ہیں، مواقع طبقاتی کے تابع اور معاشرہ کے روابط تولیدی کے مخلوق ہوتے ہیں اور حیات بشری مادی ضرورتوں اور مخصوص اوضاع کے ردعمل کے طور پر ہوتے ہیں۔

انسان اگرچہ مادی مخلوق ہے اور معاشرہ کے مادی روابط، اور طبیعی وجغرافیائی اور

نیز یا وہ علائق کا اس پر اثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے وہ عوامل بھی جن کا سرچشمہ خود آدمی کا باطن اور فطرت ہے وہ بھی طول تاریخ میں انسانوں کی سرنوشت میں موثر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان کی عقلی و فکری حیات صرف مادہ اور علائق مادہ ہی کا نتیجہ ہو یہ ناممکن سی بات ہے۔

مگر عوامل مذہبی و معنوی اور عواطف روحی کا انسان کے انتخاب راہ میں جو اہمیت رکھتے ہیں ان سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ نیز اس کا ارادہ حلقات علل و اسباب فعل یا ترک کے زنجیر کی ایک آخری کڑی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انفعالی طبعی فعل و انفعالات کے تحت تاثیر ہے اور تاریخ و عامل تولید ظہور حوادث کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں لیکن تنہا یہ عامل نہ تو تاریخی حوادث کے عامل ہیں اور نہ ہی سرنوشت انسان میں نقش اصلی رکھتے ہیں اور نہ انسان سے اس کے ارادہ و حریت کو سلب کر سکتے ہیں کیونکہ یہ عامل کمال کے اس درجہ تک پہونچ گیا ہے کہ اپنی قیمت فوق طبیعت کو پہچان لیا ہے اور اس کے زیر سایہ مسئولیت و آگاہی کو پہونچ گیا ہے۔

اسی لئے وہ مادہ کا اسیر و محکوم نہیں ہے بلکہ اس کے پاس ایسی طاقت و قوت ہے جس سے طبیعت پر حکومت کر سکے اور روابط مادی کو دگرگوں کر سکے۔

کارل مارکس KARL MARX نے نقش تنہائی کو اپنے نظریات میں اقتصادی بنیاد قرار دیا ہے اور اس کا ایک معین کنندہ عامل سے تعارف کرایا ہے۔ لیکن مارکس کا دوست اس کے کلام پر حاشیہ لگاتے ہوئے کہتا ہے: مادی تاریخ کے بینش کے مطابق، آخری نظریہ واقعی زندگی کی تجدید ہے۔ میں نے اور مارکس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

لوگوں نے مارکس کے نظریہ کو مسخ کر دیا اور اس کا مطلب یہ کر دیا کہ عامل اقتصادی ہی تنہا عامل تعیین کنندہ ہے اور اس طرح اس کی بات کو ایک بے معنی بنا دیا۔

ہاں وضع اقتصادی ہی بنیاد ہے۔ لیکن وہاں کچھ ایسے عوامل بھی ہیں جو اوپری حصہ کو تشکیل کرتے ہیں۔ مثلاً طبقاتی جنگ اور اس کے نتائج کے لئے سیاسی کیفیت، تشکیلات حاکم جو

پیروزمندی کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، حقوقی صورتیں، یہاں تک کہ مقابلہ کرنیوالوں کے افکار میں بھی جنگ کا ردعمل اسیاسی و حقوقی و فلسفی نظریات، دینی ثقافتیں، اوران امور کا اس ثقافت کی طرف پلٹ جانا جو اس میدان میں مسیطر ہے اور جو پیکار تاریخی کے جریان میں موثر ہوتی ہے اور جو بہت سے حالات میں واقعی طور پر اسکی شکل وصورت کو معین کرتے ہیں۔

یہ تمام عوامل مسلسل عمل وردعمل میں رہتے ہیں اور بطور استمرار اقتصادی حرکتیں ایسے راستے کھولتی رہتی ہیں جو ایک حتمی ضرورت کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے تناقضات کو جنم دیتی رہتی ہیں[1]۔

اب ہم کہتے ہیں: اگر اوپری حصہ کو تشکیل کرنیوالے عوامل ہی پیکار ہائے تاریخی کی شکل وصورت معین کرنیوالے ہیں تو آپ یکطرفہ طور سے اقتصاد کی تعیین کنندگی پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں؟ اور اگر اوپری حصہ کو تشکیل کرنیوالے عوامل ہی تعیین کنندہ ہیں تب تو یہ ہمارے مفروضہ کی بناپر یہ دہی بنیادی ہیں!

اس کے علاوہ اگر دو چیزیں ایک دوسرے کے وجود کی شرط ہیں اور باہم وابستہ ہیں تو بنیادی کو اولویت دینے کا کیا مطلب ہے؟

جس طرح تغیرات طبیعت علل و عوامل خارجی کے تابع ہیں اسی طرح بشری معاشرے میں بھی کچھ سنن و قوانین ہیں جنکی بنیاد پر امتوں کا زوال و انحطاط یا ترقی و اقتدار ہوا کرتا ہے اس بناپر تاریخی حوادث تو اندھے جبر کے تابع ہیں نہ تصادف و اتفاق کے۔ بلکہ یہ تمام تحولات و تغیرات تکوین و خلق کے قوانین و سنن کے تابع ہیں اور ان سنن میں انسانی ارادہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات کو واضح و روشن کرتی ہیں کہ امتوں کی تاریخ بدلنے

---

[1] تجدید نظر طلبی ص ۲۸۱ — ۲۸۶

میں ظلم وجور، عدوان وطغیان کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے اور یہ وہ سنت الٰہی ہے جو تمام بشری معاشروں میں جاری وساری رہی ہے۔ ارشاد رب العزت ہوتا ہے :۔

١۔ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ‎(الاسراء٭ ٦/١٧)

اور ہم کو جب کسی بستی کا ویران کرنا منظور ہوتا ہے تو ہم وہاں کے خوشحالوں کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ اس میں نافرمانیاں کرنے لگے تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو گئی۔ اس وقت ہم نے اس کو اچھی طرح تباہ و برباد کر دیا۔

٢۔ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۔ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۔ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۔ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۔ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۔ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۔ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۔ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۔ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ‎(الفجر/٦-١٤)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا یعنی ارم والے دراز قد جن کا مثل تمام دنیا کے شہروں میں کوئی پیدا ہی نہیں کیا گیا اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراش کر گھر بناتے تھے۔ اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو سزا کے لئے میخیں رکھتا تھا یہ لوگ (مختلف) شہروں میں سرکش ہو رہے تھے اور ان میں بہت سے فساد پھیلا رہے تھے تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا لگا دیا۔ بیشک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

اس آیت میں بھی عذاب کی علت طغیان و عدوان کو قرار دیا گیا ہے۔
(مترجم)

٭ اس کو سورہ بنی اسرائیل بھی کہا جاتا ہے (مترجم)

قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ جو ظالم اپنے خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ تاریخ میں تکلیف دہ حادثات کے ظہور کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :۔

۳۔ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ

(القصص / ۴)

بیشک فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں بہت سر اٹھایا تھا اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو عاجز کر رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بیشک وہ بھی مفسدوں میں تھا۔

۴۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (الزخرف / ۵۴)

(غرض فرعون نے باتیں بنا کر) اپنی قوم کی عقل مار دی اور وہ لوگ اس کے تابعدار بن گئے۔ بے شک وہ لوگ بدکار تھے ہی۔

ان چاروں آیات میں غور کیجئے تو نتیجہ آپ کے سامنے آ جائیگا۔

چونکہ افراد انسان سے معاشرہ بنتا ہے اور انسان جزء معاشرہ ہونے کی وجہ سے کل سے پہلے ہوتا ہے۔ انسانی فرد اپنی عقل و حکمت و ارادہ فطری کے ساتھ اپنے ذاتی وجود میں اجتماعی وجود سے مقدم ہوتا ہے اور فرد کی روح معاشرہ کی روح کے مقابلہ میں مجبور و بے اختیار نہیں ہے

قائلین جبر نے یہ خیال کیا کہ افراد مجتمع — معاشرہ — میں اس طرح گھل جاتے ہیں جیسے جزء کل میں اور پھر وہ ایک جدید حقیقت بن کر نکلتے ہیں "مثلاً شکر و پانی مل کر شربت بن جاتا ہے۔" یعنی بطور مرکب حقیقی مانتے ہیں تو ایسی صورت میں یا تو ہم معاشرہ کے ترکیب حقیقی کا انکار کر کے افراد کی آزادی و استقلال کو قبول کریں اور یا مرکب حقیقی مان کر فرد کی آزادی و استقلال سے دست برداری کا اعلان کریں ۔ ان دونوں باتوں — معاشرہ مرکب حقیقی ہو

اور افراد آزاد و مستقل ہوں ـــــ کو ماننا ناممکن و محال ہے۔

معاشرہ اگرچہ افراد سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے مگر در عین حال امور اجتماعی و مسائل انسانی میں افراد، معاشرے کے زیر دست اور مجبور نہیں ہیں ـــ کیونکہ فطرت بشر کی اصالت ـــ جو اصل طبیعت انسانی سے مایہ حاصل کرتی ہے ـــ ہی انسان کو حریت، اختیار اور آزادی بخشتی ہے اور اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ معاشرہ اس پر جو کچھ لادنا چاہتا ہے اسی سے انکار کردے۔

اسلام اگرچہ معاشرہ کے لئے حیات موت، قدرت و طاقت کا قائل ہے اور گویا اس کو ایک مستقل شخصیت سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود معاشرہ کے اندر اصلاح اور فساد کا مقابلہ کرنے کے لئے افراد ہی کو مرکز و اصل مانتا ہے اور طبقاتی دفع کو کسی فکر یا معین عقیدہ کے لئے جبری عامل کی طرح تسلیم نہیں کرتا۔

امر بمعروف و نہی از منکر معاشرہ کے فرمان سے سرکشی کا دستور ہے اور محیط کے فساد و تباہ کاری کے خلاف ایک نافرمانی ہے۔ قرآن مجید تصریح کرتا ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدہ/۱۰۵)

اے ایمان والو تم اپنی خبر لو جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی گمراہ ہوا کرے تمہیں کچھ نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا: فِيمَ كُنتُمْ؟ قَالُوا: كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ. قَالُوا: أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء/۹۷)

بے شک جن لوگوں کی قبض روح فرشتوں نے اس وقت کی ہے کہ (دار الحرب میں پڑے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے قبض روح کے بعد حیرت سے کہتے ہیں: تم کس حالت (غفلت) میں تھے تو وہ (معذرت کے لہجہ میں) کہتے ہیں ہم تو روئے زمین پر بیکس تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی ایسی لمبی چوڑی زمین میں اتنی بھی

گئی تھی کہ تم دیکھیں ہجرت کر کے چلے جاتے۔ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کی باتوں کو ناپسند کر رہی ہے جو یہ عذر کرتے ہیں کہ بھائی ہم اپنے ماحول و حالات سے مجبور ہیں! آیت ان کا عذر قابل سماعت نہیں سمجھتی۔

جب تک انسان با اختیار نہیں ہے، اس وقت تک تقویٰ بے معنی لفظ ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کی آزادی کا لازمہ ہے۔ کسی بھی شخص کے استقلال اور شخصی قدر و قیمت کا اقرار اسی وقت کیا جاتا ہے جب معلوم ہو جائے کہ یہ سالک حق ہے نفس کا مخالف ہے۔ لیکن اگر فطری تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں تو پھر ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو انسان کو معین راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے اور نہ ایسی کوئی طاقت ہے جو انسان کو کسی فعل کے ترک پر مجبور کر دے تو اسی وقت انسان خود سازی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اگر انسان ضمنی طور سے — نہ کہ شعوری طور سے — اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی وضع فاسد کے بدلنے کا ارادہ کرے تو وہ متقی کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ البتہ اگر اس کے تمام اعمال و افعال صمیم قلب سے شعوری طور پر قصد و اختیار کے ساتھ ہوں تب وہ متقی کہلانے کا مستحق ہے۔

قائلینِ اختیار

اس مکتبِ خیال کے لوگ کہتے ہیں: انسان خود ہی اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں آزاد ہے اپنے حسبِ دل خواہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اپنے حسبِ خواہش جو قدم چاہے اپنی زندگی میں اٹھا سکتا ہے۔ ایسے قوانین کا وجود جو انسان کو یہ شعور عطا کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے جواب دہ ہے، بعض اعمال پر ندامت و پشیمانی، وہ سزائیں جو قانون نے مجرمین کے لئے معین کر دی ہیں، انسان کے وہ اقدامات جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے، علوم و ٹکنالوجی کے میدان میں انسانی ایجادات یہ ساری چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے۔

اسی طرح مسئلۂ تکلیف، بعثتِ انبیاء، الٰہی قوانین کا انسانوں کے لئے پیش کرنا، معاد، یہ ساری چیزیں بھی انسان کے افعال و اعمال میں اس کی حریت و اختیار پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ایک بے معنی سی بات ہے کہ خدا اپنے بندوں کو مکلف بنا کے بلکہ ان کو افعال پر مجبور کر کے ثواب یا عقاب دے۔

اسی طرح یہ بات خلافِ انصاف ہے کہ خالقِ کائنات اپنے قدرت و ارادہ سے ہم کو جس کام پر جیسے چاہتا ہے لے جائے اور پھر اس فعل کی خاطر جو ہم سے بے اختیار سرزد ہوا ہے ہم کو سزا دے!

اگر واقعاً لوگوں کے تمام افعال خدا کا فعل ہے ــ بندوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہے ــ تو تمام تباہ کاریاں، ظلم و ستم، خدا کی طرف سے ہوتے ہیں حالانکہ ذاتِ اقدسِ الٰہی ہر قسم کے ظلم و تباہ کاری سے منزہ ہے۔

اگر کسی بھی کام میں ہمارے انتخاب و اختیار کو دخل ہی نہیں ہے تو تکلیف ایک غیر عادلانہ فعل ہوگا اور نہ عبادات و ہر مستحق ملامت ہوں گے اور نہ انصاف کرنے والے مستحق تعریف ہوں گے ۔ کیونکہ مسئولیت تو صرف امکانات اور اختیاری چیزوں میں ہوا کرتی ہے ۔ انسان اسی وقت ملامت یا مستحق ستائش و تعریف ہوتا ہے جب اپنے عزم و افعال میں مختار ہو ورنہ نہ ملامت ہوسکتی ہے نہ تحسین۔ آزادی انسان کے سلسلہ میں ایک گروہ حد افراط میں داخل ہو گیا ہے اس گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان بلا کسی منازع کے مختار مطلق ہے ۔ گویا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا ان اوامر کے صدور کا حکم نہیں دے سکتا جو بندوں کے افعال سے متعلق ہیں اور نہ ہی بندوں کے اختیاری افعال سے خدا کی قدرت کا کوئی تعلق ہوسکتا ہے ۔ بالفاظ دیگر خدا عاجز ہے کہ بندے کے فعل اختیاری کے سلسلہ میں کوئی اپنا حکم نافذ کر سکے ۔

یہ حضرات جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث کو ایک فطری نظام کے تحت بنا کر اپنا کام ختم کر دیا ۔ کائنات کی خلقت کے بعد اس میں ہونے والے واقعات و حوادث کا ڈائریکٹ خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور بندوں کے افعال بھی جہان ہستی کے واقعات و حوادث میں سے ہیں لہٰذا ان کا بھی خدا سے ڈائریکٹ کوئی رابطہ و واسطہ نہیں ہے اور خدا بندوں کے افعال میں کسی بھی قسم کی مداخلت یا تصرف نہیں کرتا ۔ قائلین بالاعتقاد کے عقائد کا یہ خلاصہ ہے جس کو ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ: موجوداتِ کائنات کو نوامیس طبیعت اور انسانی ارادہ وجود میں لاتا ہے اور دوران عالم و اعمال بشر کا خداوند عالم سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے ۔ وہ شخص درحقیقت کون میں تاثیر کو ایک دوسرے مرکز کی طرف منسوب کرتا ہے جو خود مخلوقات سے ہے بس ایسا شخص مخلوقات کو خدا کے ساتھ خالقیت میں شریک جانتا ہے اور خدا کے مقابلہ میں ایک دوسرے پروردگار کا قائل ہو گیا ہے اور شعوری یا لاشعوری طور پر ذات خدا کے ساتھ ذات موجودات کے استقلال کا قائل ہو گیا ہے ۔

اور کسی بھی موجود کے لئے — خواہ وہ بشر ہو یا غیر بشر — حریت تامہ کا عقیدہ مستلزم شرک ہے یعنی اس موجود کو خدا کے ساتھ فاعلیت واستقلال میں شریک ماننا ہے۔ اور بے شک یہ بات خود دوگانہ پرستی کی ایک قسم ہے۔ جو انسان کو توحید کی بلندی سے گرا کر شرک کی تاریک کھائی میں ڈھکیل دیتی ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم سے اسکی فرماں روائی کی قلمرو سے "جو تمام نظام ہستی پر محیط ہے" سلب اختیار کر لیا جائے اور بشر کو اس کے قلمرو اختیار میں بلا شرکت غیر ایک مطلق العنان حاکم مان لیا جائے جس کا کوئی معارض نہ ہو۔ اور کوئی بھی واقعی توحید پرست اس قسم کی فاعلیت کو چاہے وہ کتنی ہی محدود ہو — عالم ہستی اور اعمال بشر — کبھی بھی قبول نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر توحید پرست پر — یعنی اس عالم میں کہ وہ علل واسباب طبیعت کا قائل بھی ہو — واجب ہے کہ حوادث وظواہر میں صرف خدا ہی کو مؤثر حقیقی تسلیم کرے۔ اور ہر موحد کو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اگر خدا انسان کے افعال واعمال میں انسان کے ارادہ واختیار کو سلب کرنا چاہے تو سلب کر سکتا ہے۔

موجوداتِ جہاں جس طرح اپنی ذات میں استقلال نہیں رکھتے بلکہ ذات خدا سے وابستہ ہیں اسی طرح یہ موجودات علیت وتاثیر میں بھی استقلال نہیں رکھتے اور اسی عقیدہ کو "توحید افعالی" کہا جاتا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین رکھیں کہ نظام ہستی اپنے تمام علل ومعلولات وسنن کے ساتھ خدا کا فعل ہے اور اسی کے ارادہ سے ان چیزوں کا وجود ہوا ہے اور اسی طرح عامل وسبب کا درحقیقت وجود اور اسکی فاعلیت وتاثیر بھی خدا ہی کا عطیہ ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر "توحید افعالی" کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم جہان ہستی کے نظام سبب ومسبب کا انکار کر دیں اور یہ کہنے لگیں کہ ہر حرکت ہر اثر خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور عامل کا وجود وعدم برابر ہے — بلکہ ہم خدا کے ساتھ عالم اسباب کے بھی قائل ہیں (مترجم)

البتہ اگر یہ تصور کیا جائے کہ نظام ہستی سے خدا کی نسبت اسی طرح ہے جس طرح

ہنرمند کی نسبت ہنر کی طرف ہوتی ہے۔ بعض اوقات مثال جیسے اسٹیج اور اس کا بنانے والا کہ اسٹیج اپنے وجود میں بنانے والے کا محتاج ہے۔ لیکن جب فنکار نے اسٹیج بنا دیا تو پھر اب فنکار کی ضرورت نہیں ہے وہ حسین و جمیل اسٹیج لوگوں کو دعوت نظارہ دیتا رہے گا چاہے اس کا بنانے والا مر جائے۔ اگر کوئی اس قسم کا تصور خدا اور اس کی مخلوقات کے لئے کرے تو یقیناً شرک ہے۔ اور عقیدہ توحید کے منافی ہے۔

علاوہ اس کے جو شخص موجودات اور انسانوں کے اعمال میں نقش خداوند عالم کا انکار کرتا ہے وہ قہری طور پر خدا کی قدرت کو محدود کرتا ہے اور یہ تحدید قدرت عقل و منطق کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں پہلی تو یہ کہ یہ بات جہاں عمومیت قدرت پروردگار عالم کے انکار کو مستلزم ہے۔ وہاں اس ذات غیر محدود و لامتناہی کی محدودیت کو بھی مستلزم ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ اس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مخلوق خالق سے مستغنی ہے اور یہ احساس انسان کو طغیان و سرکشی پر آمادہ کرتا ہے درآں حالیکہ خالق کے حضور میں تسلیم مطلق اور اس سے تعلق اور اس پر بھروسہ کرنے کا عکس اثر انسان کی شخصیت و اخلاق اور اس کے سلوک و روحانیت پر پڑتا ہے اور چونکہ اس کے ظاہر و باطن میں خدا کے سوا کوئی حاکم فرمانروا نہیں ہوتا اسی لئے نہ خواہشات نفسانی اسکو اپنی گرفت میں لے پاتی ہیں اور نہ کوئی انسان اسکو اپنی غلامی میں لے سکتا ہے۔

خداوند عالم نے قرآن مجید میں کائنات کے ادارہ کرنے میں کسی بھی مخلوق کی شرکت کو بالکلیہ ختم کر دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (الاسراء/۱۱۰)

اور کہو کہ ہر طرح کی تعریف اس خدا کو (سزاوار) ہے۔ جو نہ تو کوئی اولاد رکھتا ہے اور نہ (سارے جہان کی سلطنت میں) کوئی اس کا ساجھے دار ہے

اور نہ اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سرپرست ہو اور اس کی بڑائی اچھی طرح کرتے رہا کرو۔

قرآن مجید نے بہت سی آیتوں میں خدا کی قدرت مطلقہ کو صراحت سے بیان کیا ہے مثلاً:-

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(المائدہ — ١٢٠)

سارے آسمان و زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب خدا ہی کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر (و توانا) ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (فاطر/٤٤)

اور خدا ایسا (گیا گزرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں بے شک وہ بڑا باخبر (اور) بڑی (قابو) قدرت والا ہے۔

یاد رکھیے موجوداتِ عالم جس طرح اپنی بقا میں خدا کی محتاج ہیں اسی طرح کاملا اپنے حدوث — خلقت — میں بھی محتاج ہیں — اور مجموعہ کائنات کو ہر وقت خداوند قدوس سے فیض وجود کا استفادہ کرتے رہنا چاہیے۔ ورنہ یہ نظام درہم برہم ہو سکتا ہے کیونکہ عالی قوتوں سے جو بھی صادر ہوتا ہے وہ خدا کی خالقیت و فاعلیت کے طفیل ہی میں ہوتا ہے۔ اور ماہیت موجودات کو ارادہ خداوندی سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس بنا پر کسی ماہیت کو بھی ذاتی استقلال حاصل نہیں ہے اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے بجلی کے بلب کے لئے ضروری ہے کہ ابتداء وہ خزانہ سے بجلی لے اور بقائے روشنی کے لئے بھی خزانہ سے طاقت حاصل کرتا رہے۔ قرآن مجید صراحت سے کہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ

(سورہ فاطر/١٥)

لوگو تم سب کے سب خدا کے (ہر وقت) محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے پرواہ ستودہ اور حمد (وثنا) ہے۔

اس طرح تمام حقائق اس کے ارادہ سے پیدا ہیں اور اس سے وابستہ ہیں اور ہر وجود علی الدوام اس سے استمداد کرتا ہے اور پورا نظام وجود صرف ایک محور کے گرد گھومتا ہے

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :-

خدا لوگوں کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور خدا کی سلطنت میں وہ چیز نہیں ہو سکتی جس کو وہ نہ چاہے (اصول کافی ج ۱ ص ۱۶۰)

اگر پروردگار عالم ہر وقت ہم پر حریت ارادہ، امکانات، قوت، حیات کا فیضان نہ کرتا رہے تو ہم کسی بھی عمل کے کرنے پر قادر نہ ہوں۔ کیونکہ اس کے ناتغیر پذیر ارادہ نے ہم سے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنے ارادی افعال کو اپنے اختیار سے انجام دیا کریں۔ اور جو چیز اس نے ہم سے چاہی ہے اس کا ایفا کریں اور اس نے یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے حسب خواہش و تشخیص مستقبل نیک و بد یا روشن و تاریک خود تعمیر کرے۔

پس اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ارادی افعال کا تعلق خدا سے بھی ہوتا ہے اور ہم سے بھی اور یہی مذہب حقہ شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے۔ (مترجم) — جو سرمایہ طاقت خداوند عالم نے ہم کو بخشا ہے اور ہمارے اختیار میں دیا ہے اسکو ہم جان بوجھ کر خودسازی اور نیک کاموں میں اسی طرح خرچ کر سکتے ہیں جس طرح فساد و سیاہ کاری و برائی کے لئے خرچ کر سکتے ہیں اگرچہ یہ خدا کی طرف سے ایک مخصوص چوکھٹے کے اندر ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھئے کہ طاقت خدا کی دی ہوئی ہے اور اس کا استعمال اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔

ایک مثال سے اور بات واضح کر دوں۔ فرض کیجئے ایک آدمی کے سینہ میں مصنوعی قلب لگا دیا گیا ہے اور ایک بیٹری کے ذریعہ — جو بیٹری اس قلب مصنوعی سے متصل ہے —

اس مصنوعی قلب میں حرکت بخشی گئی ہے اور اس بیٹری کے کنٹرول کرنیوالے کمرے کو ہمارے اختیار میں دیدیا گیا ہے اور اس بیٹری کی چابی ہمارے پاس ہے۔ ہم جس وقت چاہیں چابی لگا کر قلب متحرک کو ساکن کر دیں۔ یعنی یہاں پر جو چیز ہمارے اختیار میں ہے وہ ایک طاقت ہے جو بیٹری کے ذریعہ ہر وقت دل کو متحرک رکھے ہوئے ہے لیکن اس طاقت کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم جب تک چاہیں بیٹری کے ذریعہ اس طاقت سے دل کو متحرک رکھیں اور جب چاہیں اس کی حرکت کو ختم کر دیں اور دل کو جب تک متحرک رکھیں اسکو اختیار دیدیں جو چاہے کرے تو اب اگر دل اچھا یا برا کام کرے تو یہ اسکی خواہش اور اس کے اختیار کی بات ہے وہ اس طاقت سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ وہ جانے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ طاقت ہمارے کنٹرول میں ہے۔

اسی طرح ہماری طاقت خدا کی بخشی ہوئی ہے ہم جس طرح چاہیں اس طاقت کو استعمال کریں یعنی اس سے فائدہ یا نقصان حاصل کرنا بالکلیہ ہمارے اختیار میں ہے لیکن وہ طاقت خدا کے کنٹرول میں ہے جب تک چاہے وہ طاقت ہمارے پاس رکھے اور جب چاہے ختم کر دے۔ اور یہ وہی مذہب اعتدال ہے جو مذہب جبر اور مذہب اختیار دونوں سے الگ ہے اور اب ہم اسی مذہب کی — یعنی مذہب اعتدال — مزید توضیح کرنا چاہتے ہیں —

درمیانی بات

موجودات جہاں کمال کے چاہے جس درجہ میں پہونچ جائیں ۔ اس درجہ کی مخصوص ہدایت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور درجات گوناگون ہستی کے مناسبت سے ہدایت کی خصوصیت بھی مکمل طور سے متفاوت ہے ۔

یہ بات ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مختلف موجودات کے درمیان ہم جہاں چاہیں اپنی جگہ معین کرلیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ نباتات فطرت کے جبری طاقتوں میں اسیر و بے بس ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ محیط کے تغیرات کے سامنے اپنے تکامل کا مختصر سا اظہار ردعمل بھی کرتے ہیں ۔

اور جب ہم حیوانی خصوصیات کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کے خصوصیات نباتات سے مکمل طور پر تفاوت رکھتے ہیں ۔ حیوان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی غذا کی تلاش خود کرے ۔ کیونکہ طبیعت حیوان کے لئے دسترخوان نہیں بچھاتی ۔ اور نہ اس کے لئے غذا تیار کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ تلاش غذا کے لئے وہ کافی وسائل کا محتاج ہوگا ۔ لہذا خدا نے اسکو ان تمام وسائل سے مکمل کرکے پیدا کیا ہے ۔

اگرچہ حیوان قوت غریزیہ کی شدید کشش اور جاذبہ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ایک فرماں بردار موجود ہے اور عین اس حالت میں ایک حد تک آزاد بھی ہے اور کسی حد تک فطرت کی سخت گیری اور قید سے بھی اپنے کو آزاد بنا لیتا ہے ۔

علمائے حیوانات کا عقیدہ ہے کہ جب تک حیوان اپنی فطری ساخت اور قویٰ و آلات کے لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اس وقت تک اس کا غریزہ قوی تر اور فطرت کی براہ راست

حمایت و سرپرستی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اور جتنا جتنا حسی، تخیلی اور عقلی طاقتوں سے مضبوط اور استقلال و قدرت سے محکم تر ہوتا جاتا ہے اتنا اتنا ہدایت غریزی کے لحاظ سے کم و کمزور و دور ہوتا ہے۔ جیسے بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں ڈائریکٹ پدر و مادر کی تمام تر حمایت و توجہ کے ماتحت ہوتا ہے اور پھر جتنا جتنا منزل رشد سے قریب ہوتا جاتا ہے والدین کی ڈائریکٹ سرپرستی سے اتنا اتنا دور ہوتا جاتا ہے۔

انسان جو مرحلۂ تکامل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہے اور تنہا وہ موجود ہے جو قوت ارادی و قوت تمیز و تشخیص کا مالک ہے وہ غریزہ کے لحاظ سے پست ترین سطح پر ہے۔ حالانکہ تدریجی آزادی کے مرحلہ میں بہ نسبت نباتات وحیوانات کے اختیار تام کی حد تک پہونچ چکا ہے۔ لیکن تعبیرات میں معنوی فرق کے ساتھ ساتھ۔

نباتات کی تمام ضرورتوں کو مختلف طریقے سے طبیعت خود پورا کرتی ہے۔ اور حیوانات کی ضرورتوں کے سلسلہ میں ماں کی ذمہ داری آتی ہوتی ہے کہ وہ حمل اور تغذیہ اور بچہ کی حفاظت کی پابند ہوتی ہے۔ لیکن حیوانوں میں غرائز زمانہ طفولیت ہی سے بیدار و برقرار ہیں اور ماں ان کی حرکت اور تربیت کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اور اس طرف سے وہ مطمئن ہے۔ لیکن ہم انسان کو دیکھتے ہیں کہ وہ فطری طاقتوں کا مالک نہیں ہوتا، نامساعد حالات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں وہ حیوان سے بدرجہا کم تر ہے۔ اسی لئے وہ سالہا سال تک دوسروں کا خصوصاً والدین کا ـــ جب تک خودکفائی اور حد استقلال کو نہ پہونچ جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوجائے ـــ محتاج رہتا ہے۔ قرآن مجید انسان کے ضعف کی صراحت کرتا ہے "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا"۔ (النساء/۲۸) آدمی تو بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پس طبیعت انسان کو حیوان سے بہت پہلے آزاد کردیتی ہے اور اس کے حوالہ کردیتی ہے۔ اور مراحل تکامل کو طے کرنے کے ساتھ ایک طرف تو اس کے اختیارات، تحریکات اور آزادی میں وسعت ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ضرورتیں، علاقے، احتیاجات

بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنی آزادی اور اختیار سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے اس کی ضرورت اور عاجزی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

یہ مخصوص کیفیات جو موجودات ہستی کو گھیرے ہوئے ہیں مفکرین کی نظر میں اسبابِ تکامل ہیں اور موجود جس قدر بھی رشد حاصل کرتا جائے اور ترقی کی سیڑھی سے اوپر چڑھتا جائے آزادی کی طرف زیادہ سے زیادہ بڑھتا ہے ۔ اور یہ پیش رفت و ترقی ضرورتوں اور عدم تعادل کے ذریعہ پروان چڑھتی ہے اور پھر ان حالات میں تکامل کی مشین کام کرنے لگتی ہے ۔

لیکن انسان میں حریت و آزادی کی تجلی کے لئے غرائز طبیعت کے مقابلہ میں ایک مخالف عامل کا وجود ضروری ہے تاکہ انسان اپنے کو دو ایسی مخالف طاقتوں کے درمیان محسوس کرے جن میں کی ہر ایک طاقت اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو تاکہ انسان مجبور ہو کر اپنی حریت و اختیار سے حسب دلخواہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے کسی ایک کو اختیار کرے ۔ اور پھر تمام اصول جبر و تحمیل و ذہنی پیشس بندی سے اپنی بے سازی و سازندگی کا مخصوص اصول و ضوابط کی بنیاد پر آغاز کرے ۔

اور پھر اس صراع و نزاع کے درمیان یا تو انسان موہبت ربانیہ اور امانت الٰہی کا بوجھ ـــ امانت الٰہی کا بوجھ اتنا سنگین ہے کہ آسمانوں اور زمین نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا مگر انسان نے اٹھا لیا کیونکہ وہ ظالم و جاہل ہے ـــ اٹھا کر اپنی خواہشات کی آندھیوں کا اسیر ہو جائے اور انحطاط و پستی میں جا گرے ۔ اور یا پھر اپنی فکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے نافذ و انتخاب گر ارادہ کے سہارے اور اپنی بھرپور استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے رشد و تکامل کے راستہ پر چل پڑے اور سیر ارتقائی کو شروع کر دے ۔

اگر انسان غرائز کی جبری اطاعت سے آزاد ہو کر، ہاتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی غرائز کی زنجیروں کو توڑ کر، سرمایہ اور اکتسابی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کرنے پر قادر ہو جائے تو پھر اس کے عواطف و احساسات کے مراکز ضعیف ہو جاتے ہیں اور وحائل طبیعت کے چراغوں کی روشنی عقل کے سامنے مدھم پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر زندہ موجود کی ہر وہ

طاقت یا عضو جس کو بغیر استعمال چھوڑ دیا جائے تو وہ طاقت ہو یا عضو کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس جب کسی عضو یا طاقت کو بنیادی طور پر استعمال کیا جائے تو اسمیں کمال پیدا ہو جاتا ہے۔

بنابریں جس وقت انسان کا آگاہانہ و خلاق ارادہ، عقل و تشخیص کی طاقت کے الہام کے ساتھ روشنگر راہ اور اس کا مشعلِ حرکت بن جائے تو پھر آدمی کی بصیرت و تفکر، حقائق و واقعیت کے پانے کا راہ گشا اور رہبر بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ دو مخالف قطب کے درمیان تحیر و تردید کی حالت آدمی کو غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے تاکہ وہ تلاش عقل کی مدد سے صحیح راستہ اور غیر صحیح راستہ پہچان لے اور اسی خواہش و احتیاج کی بنیاد پر مراکز تفکر اپنا کام کرنے لگتے ہیں اور انسان کی فکر و آگاہی کو تقویت ملتی ہے اور جوشش و طاقت و حرکت زیادہ ہوتی ہے۔

حریت ارادہ، سرگردانی و حیرت سے نکلنے کی خواہش، زندگی سے محبت یہ چیزیں سبب پیدائش آرزو ہوتی ہیں۔ اور انسان کی خواہشات اور تکمیل مقاصد کا ذریعہ بنتی ہیں جو مسلسل ارادہ کی طاقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقصد تک پہونچا دیتی ہیں۔ اسی لئے جو موجودات اپنی ذاتی سرشت کی پیروی پر مجبور ہیں۔ ان میں آرزو و ارادہ کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ کیونکہ آرزو اور ارادہ کا تحقق وہاں ہوتا ہے جہاں اختیار ہو۔

اسی طرح علم، تمدن، آزادی خواہی، ملکیت وغیرہ کا بھی تحقق وہیں ہوتا ہے جہاں اختیار پایا جائے۔ اور انسان اپنی حریت و سعی مسلسل کے ذریعہ کمال علمی و رشد بلکہ تمام ابعاد فطرت و سرشت میں ترقی کر سکتا ہے۔ اور اپنی طاقتوں، استعداد اور بلند انسانی فطرت کی استعمال کر کے ایک ایسی منزل تک پہونچ سکتا ہے جہاں وہ فضائل کا منبع فیاض اور معاشرہ کیلئے عامل ثمردار بن جائے اور یہ سب چیزیں اختیار کے ثمرات میں سے ہیں اس طرح اختیار کے ثمرات کو ہم ہر جگہ

ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اور طرفداران اختیار و منکرین اختیار کے درمیان نزاع و کشمکش خود ہی شاہد تین ہے کہ بشر میں ضمنی طور سے اختیار کو سب ہی قبول کرتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں انسان میں اختیار کے حدود و شرائط کیا ہیں؟ اور انسان کس حد تک مختار ہے؟

اس مسئلہ — جبر و اختیار — میں شیعوں نے قرآن مجید اور مذہبی پیشواؤں سے جو عقیدہ حاصل کیا ہے وہ نہ مطلق جبر ہے اور نہ مطلق اختیار ہے بلکہ ایک تیسرا نظریہ ہے جس میں نہ تو مذہب جبر کی خامیاں ہیں، جو عقل و فکر، وجدان، اخلاقی اور اجتماعی معیار کے مخالف ہیں اور جو تمام غلطیوں اور قبائح کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور آخر میں عدل الٰہی کا انکار کر دیتا ہے اور نہ ہی اس تیسرے نظریہ میں مذہب اختیار کی خرابیاں ہیں مثلاً قدرت خدا کے عموم کا انکار، افعال و اعمال و خلق و ایجاد میں توحید کا انکار وغیرہ اور وہ تیسرا نظریہ جبر مطلق و تفویض مطلق کے درمیان کا ایک راستہ ہے۔

مذہب اعتدال

یہ بات واضح ہے کہ ہماری ارادی حرکتوں اور سورج، چاند، زمین، حیوان کی حرکتوں میں بہت ہی روشن فرق ہے۔ ہمارے باطن سے ایک ارادہ جوش مارتا ہے جو فعل و ترک کے دروازے ہمارے سامنے کھول دیتا ہے اور آزادی انتخاب کو ہمیں ہدیہ کرتا ہے۔

اعمال صالحہ اور برے اعمال کے کرنے کے لئے ہمارا اختیاری عزم، قوت تشخیص و تمیز اور ہماری مرضی سے ہوا کرتا ہے۔ اور اس عطیہ الٰہی سے استفادہ رشد و بصیرت و شعور سے ہونا چاہئے۔ پہلے تو اس کی تشخیص کرنی چاہئے، حساب کرنا چاہئے تب اختیار کرنا چاہئے اور ارادہ الٰہی یہی ہے کہ ہم اسکی حکومت میں اس آزادی سے فائدہ حاصل کریں۔

یاد رکھئے ہم جو بھی کام کرتے ہیں وہ اصلا خدا کے علم و سابق مشیت سے خارج نہیں ہوتا۔ اور تمام امور اور جریانات زندگی، انسانوں کی سیر سرنوشت سب ہی اس کے علم سے مشروط و مقید ہوا کرتے ہیں اور محدود ہوتے ہیں جو بہت پہلے سے علم خدا میں ہوتے ہیں۔ اور ہم ایک لحظہ بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اور ہمارے اندر چھپی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھانا خدا کے مسلسل و مستمر مدد کے بغیر ناممکن ہے۔

خدا اپنی عظیم قدرت قاہرہ سے اور بصیرت تامہ سے ہمارا مراقب اور ہماری نیتوں اور کرداروں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی حکومت و نظارت ہمارے تصور سے مافوق ہے اور وہ جس وقت چاہے اس رشتہ فیض کو قطع کر سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری آزادی اور ہمارا اختیار اس کے نظام عمومی سے خارج نہیں ہے اس لئے اس طرف سے مسئلہ توحید میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔

وہ انسان جو اس کائنات میں اپنی طاقت و ارادہ کے زیر سایہ موثر ہے وہ خود بھی نظام ہستی کے طبعی قوانین کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان بے اختیار پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی ارادہ و اختیار کے مرجاتا ہے۔ طبیعت اسکو ضرورتوں کی زنجیر میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور در عین حال وہ اپنی استعداد اور اپنے امکانات سے فائدہ حاصل کرنیوالا ہے۔ اور آزادی و استغنا مر اس کے اندر خلاقیت اور ایک ایسی طاقت ایجاد کرتی ہے کہ جس کے سہارے وہ طبیعت کو تسخیر اور عوامل محیط پر مسلط ہوسکے۔

اسی لئے امام جعفر صادق فرماتے ہیں: نہ جبر ہے نہ اختیار ہے بلکہ امر واقعی ان دونوں سے جبر و اختیار کے درمیان ہے۔ (کافی ج ۱ ص ۱۶۰)

پس انسان کو اختیار تو ہے لیکن ہر طرح کا نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق کے لئے اختیار کلی اور استقلال کلی چاہے وہ محدود دائرہ میں ہو۔ فاعلیت خدا میں شرک ہے۔ لیکن یہ محدود اختیار جو خالق طبیعت کے مرضی کے مطابق ہے اور جس میں اوامر الٰہی بطور سنن حاکم اس طبیعت پر جس میں بشر بھی ہے "متجلی ہوتے ہیں وہ شرک نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ میں انسان نہ تو ایسی مخلوق ہے جو قدر کا جبری محکوم ہو اور نہ ایسی مخلوق ہے جو بے مقصد تاریک محیط میں آزاد چھوڑ دی گئی ہو۔ بلکہ وہ استعداد و مہارت و آگاہی اور مختلف خواہشات سے سرشار ہے اور ایک فطری ہدایت و باطنی رہبری کے ہمراہ ہے۔

مکتب جبر و اکراہ کے پیروکاروں کو دراصل اشتباہ اس طرح ہوا کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں:

۱۔ افعال عباد کو خدا کی طرف منسوب کردیں تو انسان کے سلب آزادی اور جبر کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

۲۔ افعال عباد کو صرف بندوں کی طرف منسوب کریں تو خدا کی قدرت کی محدودیت لازم آتی ہے۔

حالانکہ ہمارے ارادہ کی حریت قدرت خدا کے عموم میں بے اثر ہے۔ کیونکہ یہ تو خدا نے ہی چاہا ہے کہ سنت الٰہی کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ شخصاً ہر کام کو ہم کر سکیں۔

بندوں کے اعمال و افعال کو ایک طرف تو خود بندوں کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف خدا سے بھی منسوب کرنا صحیح ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ افعال کی نسبت بندوں کی طرف بغیر واسطہ ہے اور خدا کی طرف جو نسبت ہے وہ باواسطہ ہے اور دونوں نسبتیں حقیقی و واقعی ہیں۔ اس طرح نہ تو ان کا ارادہ خدا کے ارادہ سے ٹکراتا ہے اور نہ ہی انسان کا ارادہ خواست و ارادہ الٰہی کے برخلاف ہے۔

اسباب کا اپنے مسببات میں اثر انداز ہونا یکتا عقیدہ اور نظام عالم میں دو مخلوقات کا افتراق نہ صرف یہ کہ خالقیت میں شرک نہیں ہے۔ بلکہ خالق کی خالقیت کے بارے میں کمال عقیدت ہے کیونکہ اس سے احاطہ اور حاکمیت مطلق اور امر و فرمان الٰہی تمام کائنات پر — جس میں انسان بھی شامل ہے — برقرار رہتا ہے۔

اگر ہم بطور اطلاق (خدا کے علاوہ) نظام ہستی میں ہر موثر کا انکار کر دیں تو حرکت مادہ کے لئے کوئی قابل قبول تفسیر نہیں ملے گی۔ اور جب موجودات کا ایک دوسرے میں موثر ہونے کا انکار کر دیں تو علت و معلول کے اثبات کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہ قول: تمام حوادث مادہ کی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خداوند عالم اپنی مداوم و مستمر خلاقیت سے دائمی طور پر مادہ میں ہر لحظہ حرکت پیدا کرتا رہتا ہے، بھی غیر منطقی ہے کیونکہ حرکت حقیقت واحدہ ہے لہٰذا یہ خود بخود مادہ کے مختلف تحولات کا باعث نہیں بن سکتی بلکہ مادہ جو بوسیلہ حرکت مختلف اشکال اختیار کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے ان مختلف اشکال کا وجود قدرت خدا کے ہاتھوں ہوا ہو تاکہ متنوع موجودات کا تحقق ہو سکے۔

یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے: حوادث و موجودات میں مادہ کا کوئی اثر ہوتا ہے کہ نہیں؟ اگر مادہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو نظام وجود میں یہ آثار متنوعہ کہاں سے آئے؟

اور اگر مادہ کا اثر ہوتا ہے تو پھر یہ قبول کرنا پڑے گا کہ خدا تمام حوادث کو ڈائریکٹ نہیں پیدا کرتا جیسے کہ علت اپنے معلول مادی کو ڈائریکٹ پیدا کرتی ہے خدا ایسا نہیں کرتا ۔ بلکہ مادہ موثر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی تمام طاقتوں اور استعداد کو خدا سے حاصل کرتا ہے ۔ اور خدا نہ مادہ ہے نہ حرکت فی المادہ ہے ۔

یہ اعتراف کر لینا کہ : خدا نے مادہ کے اندر ایسی طاقتیں اور استعداد بخشی ہیں کہ جس کے ذریعہ مادہ خود اپنے اندر اور دوسروں کے اندر تحولات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے : خدا کی خالقیت مطلقہ میں کوئی اشکال پیدا نہیں کرتا ۔ اور انسان کے لئے فاعلیت محدودہ کا قبول کر لینا ــــ اس اعتراف کے ساتھ کہ انسان میں ایسا فقر و احتیاج موجود ہے جو اس کے تمام وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے ـــــ خدا کے ارادہ و مشیت کے منافی نہیں ہے اور نہ اس سے خدا کی خالقیت لامحدود میں کوئی خلل پڑتا ہے ۔ اور نہ ہی اس سے کوئی معقول اشکال لازم آتا ہے ۔

امام جعفر صادق ؑ سے ــــ کافی ج ۱ ص ۱۸۳ پر ـــــ ایک حدیث منقول ہے فرمایا: خدا چاہتا ہے کہ اشیاء اسباب کے ماتحت جاری ہوں ۔ لہٰذا اس نے ہر شئی کے لئے سبب قرار دیا ہے ۔

خلق خدا کے اسباب میں ایک سبب انسان اور اس کا ارادہ ہے اور اس کائنات میں ہر موجود کی پیدائش کے لئے خدا کی طرف سے مخصوص اسباب و علل قرار دیئے گئے ہیں کہ جب تک وہ اسباب نہ ہوں گے وہ مسببات نہ ہوں گے ۔ اور یہ ایک عمومی قاعدہ ہے جو ہمارے افعال اختیاری کو بھی شامل ہے ۔ دیگر اسباب و علل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے ارادہ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی ہونی چاہئے ۔ تاکہ صدور فعل ہو سکے ۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن میں ہر شئی کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے وہ آیتیں در اصل ازل سے خالق عالم کے ارادہ ازلی کو بیان کرنے کے سلسلہ میں ہیں اور ان کا مقصد وجو

کی صورت عامہ کا بیان ہے اور اسکی قدرت کاملہ اور احاطہ تامہ کا اثبات مقصود ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اس کے امر کا نفاذ بلا استثناء تمام عالم کو شامل ہے۔ لیکن یہ وسیع وشامل اور عام وتام دکامل نفوذ بشری اختیارات کی آزادی کا منافی نہیں ہے کیونکہ اختیار بشر بھی تو مخلوق ہے اور اسی خدا نے یہ حریت انسان کو بخشی ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کرنیکا طریقہ اختیار کر سکے۔ اس نے کسی بھی فرد یا قوم کو دوسرے کی غلطی کا مسئول نہیں بنایا ہے۔

اور اگر یہی ضد ہے کہ بشر کو مجبور مانا جائے تو پھر انسان کو اختیار پر بھی مجبور ماننا چاہئے اور انسان کی حریت لازمۂ مشیت الٰہی ہے نہ کہ اس کی محکومیت کا لازمہ ہے۔

بنا برین جس وقت ہم کسی اچھے کام کے کرنیکا ارادہ کرتے ہیں تو وہی ہوئی طاقت تو خدا کی ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا عمل ہے خدا کا عمل نہیں ہے۔

خداوند عالم قرآن مجید میں انسان کے باارادہ ہونے کو اور عمل کی نسبت انسان کی طرف سے اس کو بیان کر رہا ہے اور جبری حضرات کی رد کر رہا ہے اور وہ اس طرح کہ عذاب دنیا اور مصائب دنیا کو انسانی عمل کا نتیجہ بتاتا ہے وہ تمام آیات جو ارادہ الٰہی سے متعلق ہیں ان میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر افعال اختیاریہ کی نسبت ارادہ الٰہی کی طرف دی گئی ہو۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (الزلزال / ۷، ۸)

تو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لیگا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے وہ اسکو دیکھ لے گا۔

وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (النحل / ۹۳)

اور جو کچھ تم لوگ (دنیا میں) کیا کرتے تھے اس کی بازپرس تم سے ضرور کی جائے گی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا: لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ: هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ؟ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (الانعام/۱۴۸)

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم لوگ شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز (اپنے اوپر) حرام کرتے۔ اسی طرح (باتیں بنا بنا کے) جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ (پیغمبروں کو) جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے ہمارے عذاب (کے مزے) کو چکھا (اے رسول) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو ہمارے (دکھانے کے) واسطے اس کو نکالو (دلیل تو کیا پیش کروگے) تم لوگ تو صرف اپنے خیال خام کی پیروی کرتے ہو اور صرف اٹکل پچو باتیں کرتے ہو۔

اگر ہدایت وگمراہی انسان میں مشیت الٰہی کی وجہ سے ہوتی تو روئے زمین پر فساد کا نام ونشان بھی نہ ملتا۔

لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا (الرعد/۳۱)

اگر خدا چاہتا تو سب لوگوں کی ہدایت کردیتا۔

منحرفین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر قسم کا فساد خدا کے ارادہ سے واقع ہوتا ہے جیسا کہ خود قرآن نے حکایت کی ہے:۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا: وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (الاعراف/۲۸)

اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے باپ داداؤں کو پایا اور خدا نے (بھی) یہی حکم دیا ہے (اے رسول) تم صاف

کہہ دو کہ خدا ہرگز برے کام کا حکم نہیں دیتا کیا تم لوگ خدا پر افترا کرکے وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

خداوند عالم نے جس طرح عمل صالح کے لئے ثواب مقرر کیا ہے اسی طرح فساد و باطل کے لئے جزا اور عقاب بھی مقرر کیا ہے لیکن گناہوں پر سزا مقرر کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس نے گناہوں کے کرنے کو بھی کہا ہے۔ اگر کوئی سمجھدار آدمی مٹی کے تیل کے اسٹاک میں ماچس کی تیلی جلائے اور تیل کو آگ لگ جائے تو ممکن ہے خود جلانے والا بھی اس میں جل جائے۔ یہ ایک فطری قاعدہ ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے اور آگ جلانے والے نے اگرچہ اس قاعدہ کو جانتے ہوئے یہ اقدام کیا ہے۔ تو پھر اس کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ فطری ضرورتوں کے تابع نہیں ہے بلکہ قطعاً انسان کی طبیعت کے بھی خلاف ہے۔

مسئلہ جبر و اختیار میں انسان کی ہستی اور اس کے افعال کے طبعی آثار تو ارادۂ الٰہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے اختیاری افعال خود انسان کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں۔

پس شیعی نقطہ نظر سے اسلامی نظریہ یہ ہے کہ انسان اس قسم کے ارادۂ مطلقہ کا حامل نہیں ہے کہ خدا کے اس ارادہ و مشیت کے برخلاف جو قوانین و سنن ثابتہ کی صورت میں کائنات کے اندر پھیلے ہوئے ہیں ان کے چنگل سے نجات حاصل کرکے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ۔ معاذ اللہ۔ خدا نہ تو اپنی مخلوق کے مقابلہ میں کمزور ہے نہ عاجز ہے نہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور نہ آدمی اتنا مجبور ہے کہ وہ حسب دلخواہ اپنے لئے زندگی کا راستہ بھی منتخب نہ کر سکے اور حیوانات کی طرح دست بستہ غریزہ کا اسیر ہو۔

قرآن مجید نے تصریح کر دی ہے کہ خدا نے لوگوں کو سبیل ارشاد کی ہدایت کر دی ہے لیکن انسان کو اس بات پر مجبور نہیں کیا ہے کہ ہدایت و فلاح کا راستہ اختیار کرے اور نہ اس پر مجبور کیا ہے کہ ضلالت و گمراہی کا راستہ اختیار کرے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۔ ہم نے انسان کو راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا (دہر ۳)

پس ثابت ہوا کہ انسان کے اختیاری افعال کی نسبت خدا کی طرف دینا قرآن کی نظر میں مردود ہے۔

مسئلہ قضا و قدر

قضا و قدر

مسئلہ قضا و قدر ان جنجالی مسائل میں سے ہے جس میں بہت سے مواقع میں مختلف اسباب کی وجہ سے تحریف ہو گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کو لوگوں نے دقت نظر سے سمجھا ہی نہیں اور جن لوگوں نے سمجھا بھی اس میں ان کو ان کی بدنیتی نے الجھا دیا۔ اسی لئے ہم یہاں پر مختصر طریقہ سے اس کے بارے میں بحث کریں گے اور کوشش بھر سمجھنے و سمجھانے کی سعی کریں گے۔

دیکھئے اس کائنات میں ہر چیز کو حساب و منطق اور دقیق قانون کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اور ہر چیز اپنے حدود و مشخصات کو ان علل و موجبات سے کسب کرتی ہے جس سے وہ وابستہ ہے جس طرح ہر موجود اپنے وجود کو اپنی علت سے حاصل کرتا ہے اسی طرح تمام ظاہری و باطنی خصائص کو بھی علت ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اور اسی کی طرف اندازہ گیری بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہر علت و معلول میں ایک قسم کی مجانست و سنخیت ہوتی ہے۔ اس لئے طبیعی طور سے ہر علت اپنے مناسب اثر کو اپنے معلول میں منتقل کرتی ہے۔

اسلام کی نظر میں قضا و قدر کا مطلب، خدا کا وہ قطعی حکم ہے جو کائنات کے امور کے جریان اور ان کے حدود و اندازہ کے بارے میں ہو۔ اور نظام آفرینش میں ہونے والی ہر چیز — اور اسی میں اعمال انسان بھی شامل ہیں — اپنی علت کی طرف سے حکم قطعی پاتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ علیت کا عام قاعدہ ہر چیز کو شامل ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ میں ہے اور یہ ہے کہ انسان کے اختیاری افعال بھی علیت کے عام قاعدہ کے اندر آتے ہیں۔

یعنی ہر معلول کے لئے ایک علت ضرور ہوتی ہے (مترجم)

قضا : یعنی وہ مضبوط و حتمی عمل جس میں رجوع نہ ہو۔ اور یہ خدا کا فعل ہوتا ہے یعنی خالقیت۔
قدر : یعنی اندازہ ، یعنی نظامِ آفرینش کا ایک سسٹیمٹک ہونا ہے۔ اسی کو نظامِ آفرینش
کے جریان کی کیفیت و چگونگی کا بیان کرنے والا بھی کہا جاتا ہے ۔ اس تفسیر کے مطابق یعنی
ہوں گے کہ خدا نے ایک سسٹیمٹک اور حساب شدہ جہانِ ہستی کو پیدا کیا اور قدر
اس کی خالقیت کا محصول ہے جس کا اثر تمام موجودات میں ہے۔

اور تقدیر سے مراد خارجی و عینی اندازہ گیری ہے ۔ یعنی عمل تحدید خارجی ہے۔ مکان کا نقشہ بنانے والے انجینیر جس طرح مکان کا نقشہ اور خاکہ ذہنی طور پر مکان تیار ہونے سے پہلے بنا لیتے ہیں وہ والا اندازہ مراد نہیں ہے اور قرآن مجید انھیں قالب ہائے ثابت کو تمام خصوصیات کے ساتھ اور ہر چیز کے اندازہ کو قدر کے نام سے یاد کرتا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر/۴۹)

بیشک ہم نے ہر چیز ایک مقررہ اندازے سے پیدا کی ہے۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق/۳)

خدا نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

تمام عقلی اور طبعی ضرورتوں کو اور تمام ان اجزائے علت کو جو حوادث کی پیدائش کا موجب ہوتے ہیں خدا نے ان کو "قضا" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنے معین شروط کے ساتھ جب تک وہ اندازے پورے نہ ہو جائیں اور مقتضیات مکمل نہ ہو جائیں قضاء کا وجود نہیں ہوا کرتا۔

خداوند عالم موقعیت زمانی و مکانی اور حوادث کے حدود کو نظر میں رکھ کر پھر اسی بنیاد پر قضا کا حکم نافذ کرتا ہے۔ اور اس عالم میں جو بھی عامل ظاہر ہوتا ہے وہ علم و ارادہ حق کا مظہر ہوتا ہے اور قضائے الٰہی کے نفاذ کا وسیلہ ہوتا ہے۔

ہر چیز کے اندر تکامل کی استعداد ہوا کرتی ہے۔ اور مادہ جو قانون حرکت کے ماتحت ہے اس میں مختلف صورتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد ہوتی ہے اور عوامل کے

کے تحت تاثیر مختلف حالات و کیفیات کی بھی صلاحیت ہوتی ہے ۔ یہی مادہ بعض عوامل سے ایسا ایندھن لیکر جو اسکو حرکت پر آمادہ کر سکے بعض دوسرے عوامل سے ٹکرا کر ان کی صورت میں آکر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے ۔ اور کبھی اپنی پیشروی کو باقی رکھتے ہوئے مختلف مراحل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حد کمال تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی پیشروی کو باقی نہ رکھ کر ٹھہر جاتا ہے ۔ کبھی تو بطور عجلت اپنی حرکت میں سرعت پیدا کرتا ہے اور کبھی تقدم کو طے کرنے کے لئے جس سرعت کی ضرورت ہوتی ہے اس کو ختم کر دیتا ہے اور بہت ہی سست رفتاری سے حرکت کرتا ہے ۔

پس اس کی بازگشت ایک ہی قسم کے قضا و قدر سے مربوط نہیں ہے ۔ کیونکہ علت ہی معلول کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے ۔ اور چونکہ مادی موجودات کا تعلق مختلف علتوں سے ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کے مسیر میں تفاوت ہوا کرتا ہے ۔ اور ہر علت موجود معلول کو ایک مخصوص ڈھرّے پر لگا دیتی ہے ۔

فرض کیجئے ایک شخص آنت بڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ بیماری کسی مخصوص وجہ سے ہوئی ہوگی اور اس کا انجام دو طرح ہو سکتا ہے :

۱ ۔ آپریشن کرا کے ٹھیک ہو جائے تو اس کا ڈھرّا اس علاج کی وجہ سے بدل گیا ۔

۲ ۔ یہ آپریشن نہ کرا کے مر جائے تو یہ دوسرا راستہ ہوگا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کے راستے مختلف اور متغیر ہیں اور خود مریض کی مرضی کے تابع ہیں لیکن مریض کی مرضی ــــ چاہے جو بھی ہو ــــ قضائے الٰہی کے دائرے سے خارج نہیں ہے ۔

یہ بات قطعی شرعاً و عقلاً غلط ہے بلکہ سوچنا بھی ناجائز ہے کہ مریض یہ کہکر بیٹھ جائے کہ اب تو مقدر کی بات ہے اگر قسمت میں زندگی لکھی ہے تو زندہ رہوں گا علاج کروں یا نہ کروں اور اگر قسمت میں موت لکھی ہے تو چاہے ہزار علاج کروں مر جاؤں گا ــــ اب اگر مریض علاج کرا کے اچھا ہو جاتا ہے تو یہی اس کی تقدیر و قسمت ہے اور اگر علاج نہ کرا کے مر جاتا ہے تب بھی اس کی یہی تقدیر و قسمت ہے ۔ دونوں صورتیں اس کا مقدر ہیں ۔

جو لوگ سستی اور کاہلی کرتے ہیں اور کسی قسم کا کام نہیں کرتے ۔ پہلے طے کر لیتے ہیں کہ کام نہ کریں گے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں اور جب جیب خالی ہو جاتی ہے اور فقیر ہو جاتے ہیں تو اپنی فقیری کو مقدر کے سر تھوپ دیتے ہیں ـــــ لیکن اگر یہی لوگ کام کرتے محنت مزدوری کرتے اور پیسے والے ہو جاتے جب بھی وہ تقدیر ہی کا کرشمہ ہوتا ۔ لہٰذا چاہے انسان کام کرے یا نہ کرے بہر صورت وہ تقدیر ہے ۔ خلاف تقدیر کچھ نہیں ہے ۔

بنا بریں سرنوشت میں تبدیلی و تغییر قانون علیت کے مخالف نہیں ہے ۔ جو عامل بھی کائنات میں موثر ہے وہ علیت عمومی کے قلمرو سے خارج نہیں ہے اور جو چیز سرنوشت کے تغیر و تبدیلی کا سبب بنتی ہے وہ خود بھی حلقہ ہائے علیت میں سے ایک حلقہ ہے اور مظاہر قضا و قدر الٰہی کا ایک عامل ہے ۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ایک قضا و قدر دوسرے قضا و قدر سے بدل جاتا ہے ۔

البتہ قوانین میٹافیزیقی ـــــ حیات بعد الموت ـــــ کا تعلق حوادث سے ایک طرح کا نہیں ہوتا جیسے کہ قواعد علوم بھی اس سے زیادہ کے معاملہ نہیں ہوتے ۔ قوانین میٹافیزیقی ظاہر و حوادث پر حکومت کرتے ہیں البتہ انتہائی ات یہ سب تفاوت ہیں ۔ اور در حقیقت حوادث و ظواہر اور ان کی جہت گیریاں سب ہی قوانین میٹافیزیقی کے محکوم ہیں ۔ حوادث کا رخ چاہے جدھر ہو وہ ان قوانین کے چوکھٹے سے باہر نہیں ہوتے یوں سمجھئے کہ حوادث ایک قسم کے زندہ موجودات ہیں جو ایک وسیع جنگل میں چر رہے ہیں چاہے جدھر کا رخ کیا کریں گے اسی جنگل میں ہیں شمال جنوب مشرق ، مغرب جدھر بھی جائیں اس جنگل سے خارج نہیں ہو سکیں گے ۔

اور قضا و قدر الٰہی وہی اصل علیت کا ہر جگہ وجود ہے اور ایک امر میٹافیزیقی ہے جس کو احکام علم کے ساتھ یکساں شمار نہیں کیا جا سکتا ۔

اصل علیت صرف اتنا بتاتی ہے کہ ہر حادثہ کے لئے ایک دلیل ضرور ہوتی ہے ۔ اس کے بعد حوادث کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کوئی پیشنگوئی نہیں کر سکتی ۔ اور قانون میٹافیزیقی

ہیں اصلاح کی صلاحیت نہیں ہے ۔

قانون میٹافیزیقی کائنات کے مختلف حوادث کے لئے ایک زمین ہے ۔ حوادثات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے یہ قانون — یوں سمجھئے — ایک سڑک کی طرح ہے جس پر لوگ چلتے ہیں اس کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون کس طرح جا رہا ہے ؟ اور کون کس طرف ؟

حضرت علیؑ ایک شکستہ دیوار کے نیچے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے دفعۃً وہاں سے اٹھ کر دوسری دیوار کے سایہ میں آبیٹھے ! لوگوں نے کہا اے علیؑ قضائے الہی سے فرار کرتے ہو ؟ فرمایا قضائے الہی سے اس کی قدر کی پناہ لیتا ہوں[1] ۔ یعنی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف گریز کرتا ہوں ۔ بیٹھنا اور فرار کرنا دونوں تقدیر الہی ہیں ۔ اگر شکستہ دیوار گر جائے اور مجھے ضرر پہونچ جائے تو یہ بھی قضا و قدر ہے اور اگر جائے خطر سے دور ہو جاؤں تو یہ بھی قضا و قدر ہے ۔ قرآن مجید ان نظام و قوانین طبیعت کو جو کائنات پر حاکم ہیں اور حتمی و ناقابل تغیر حیثیت رکھتے ہیں بطور سنت الہی یاد کرتا ہے :

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (الاحزاب/۶۲)

اور تم سنت الہی کے اندر ہرگز تغیر و تبدل نہ پاؤ گے ۔

اور اسکو بھی سنت الہی قرار دیتا ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور/۵۵)

(اے ایماندارو !) تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین

[1] کتاب توحید صدوق

پر نائب مقرر کرے گا ۔ جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انھیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے خائف ہونے کے بعد (ان کے ہراس کو) امن سے ضرور بدل دے گا کہ وہ (اطمینان سے) میری عبادت کریں گے اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنائیں گے اور جو شخص اس کے بعد بھی ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں ——

اسی طرح یہ بھی سنت الٰہی قرار دیتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد ۱۱)

جب تک لوگ خود اپنی نفسی حالت میں تغیر نہ ڈالیں خدا ہرگز تغیر نہیں ڈالا کرتا۔

اسلامی نظریہ میں واقعیات کا انحصار صرف مادی علتوں ہی میں نہیں ہے اور نہ ہی حسی علاقات اور مادی ابعاد تک نظر کو محدود رکھنا چاہیئے ۔ کیونکہ معنوی عوامل بھی اس حد تک ہیں کہ جہاں عوامل مادی کے پہونچنے کا امکان نہیں ہے اور ان عوامل معنوی کا دقیق حادثات میں مستقل ہاتھ ہے ۔ کائنات کی ترازو میں نیکی و بدی میں فرق ہے انسانی زندگی میں احسان کے ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے ۔ مثلاً بنی نوع انسان کے ساتھ احسان ، خیر ، خدمت ، محبت ، مودت یہ وہ اسباب ہیں جو انسان کے انجام کو سعادت اور نعیم دائم میں بدل دیتے ہیں ۔ اور ستم ، ظلم ، تجاوز ، سرکشی ، خواہشات نفس کی پیروی ، غیر مشروع خود پرستی کا نتیجہ ہمیشہ تلخ ، برے اثرات ، پر تمام ہوتا ہے ۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گویا کائنات خود مکافات عمل دیتی ہے اور گویا یہ کائنات بنفسہ سمیع و بصیر ہے ۔ بلکہ اعمال کے انجام بھی منجملہ قضا و قدر ہیں کہ جس سے فرار ممکن نہیں ہے ۔ تم جہاں بھی جاؤگے

وہ تمہارا دامن گیر ہوگا ۔

ایک دانشمند کہتا ہے: کائنات کو بے شعور نہ کہو ورنہ تم اپنی طرف بے شعوری کی نسبت دوگے کیونکہ تم کائنات سے پیدا ہوئے ہو۔ اگر کائنات میں شعور نہیں ہے تو تم میں کہاں سے آگیا؟

قرآن عوامل معنوی کے لئے کہتا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (اعراف/۹۶)

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے مگر (افسوس) ان لوگوں نے (ہمارے پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کی کرتوتوں کی بدولت ان کو (عذاب میں) گرفتار کیا۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ (القصص/۵۸)

اور ہم تو بستیوں کو برباد کرتے ہی نہیں۔ جب تک وہاں کے لوگ ظالم نہ ہوں۔

یہی مسئلہ قدر و قضا مکتب جبر کے پیروکاروں کے دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔ وہ سمجھتے ہیں: انسان سے مستقلاً کوئی کام سرزد نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم نے انسان کے ہر کام کو خواہ وہ کلی ہو یا جزئی، بد ہو یا نیک مقدر کر دیا ہے لہٰذا انسان کے فعل اختیاری کا کوئی مورد باقی نہیں رہتا۔ لیکن جبر اور حتمی انجام میں یہ فرق ہے کہ ہر حادثہ کا ظہور اس وقت لازمی ہو جاتا ہے جب اس کے تمام اسباب و علل متحقق ہو جائیں اور منجملہ اسباب و علل خود انسان کا ارادہ بھی ہے، اور چونکہ انسان ایک موجود مختار ہے اس لئے اس کے اعمال اپنے ہدف معین کے ساتھ ہوتے ہیں ـــ اور انسان بارش کے قطرہ کی طرح نہیں ہے کیونکہ بارش کا قطرہ ایک مخصوص جگہ سے چل کر قوت جاذبہ کے طفیل مخصوص جگہ ہی پر گرتا ہے لیکن انسان اپنے اعمال میں اپنے

قانون کے مطابق فطرت کا پابند نہیں ہے ۔ اور اگر وہ قطرہ کی طرح پابند ہوتا تو اپنے اس مقصد میں جس میں غور و فکر کرتا رہتا ہے اپنی مرضی سے اقدام نہیں کر سکتا تھا ۔ بخلاف قانون جبر کہ وہ ایک ایسا انسان موجود مانتا ہے جو آزاد تو ہے مگر اس کے ارادے مفلوج و معطل ہیں اپنے ارادہ کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا اور وہ یہ بھی نظریہ رکھتا ہے کہ تمام علتیں ذات انسان سے خارج ہیں اور تمام علتوں کا تعلق صرف خدا سے ہے ۔

پس قضا و قدر اس وقت مستلزم جبر ہوں گے جب یہی قضا و قدر انسان کی طاقت اور ارادہ کے جانشین ہوں ۔ اور انسان کے ارادہ و خواہش کا اس کے اعمال میں کوئی بھی عمل دخل نہ ہو ۔ حالانکہ قضا و قدر الٰہی دہی نظام سبب و مسبب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے ۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہماری تمام خواہشیں پوری نہیں ہو پاتیں لیکن یہ انسان کے مجبور ہونے کی بھی دلیل نہیں ہے ۔ کیونکہ بشر کے لئے اختیار کا قائل ہونا اور اسی کے ساتھ اس کے اختیار کو صرف اس کے اعمال میں محدود کر دینے میں کوئی منافات نہیں ہے ۔ اور اثبات اختیار کی دلیلیں انسان کے لامحدود اختیار کو نہیں ثابت کرتیں ۔

سرزمین وجود پر پروردگار عالم نے بہت سے عوامل خلق کئے ہیں ۔ کبھی تو یہ عوامل انسان پر واضح ہو جاتے ہیں مگر کبھی پوشیدہ و مخفی رہ جاتے ہیں ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر انسان قضا و قدر کی واقعی اور دقیق تفسیر سمجھ لے تو پھر یہی انسان اپنی معلومات کے چوکھٹے کے اندر اپنی طاقتوں سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ کوشش کرنے لگے گا ۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ معرفت واقع حاصل ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں زیادہ کامیابی حاصل کر سکے ۔ اور خواہشوں کا پورا نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ انسان کی قوتیں محدود ہیں ۔ حصول کامیابی کے عوامل تک رسائی نہیں ہو پاتی جس کے نتیجہ میں خواہشیں نقش برآب ہو جاتی ہیں ۔

پس معلوم ہوا کہ ہر موجود کا انجام اپنی سابق علتوں سے مربوط ہوتا ہے ۔ مگر وہ بھی

اصل علیت عمومی کے قبول کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ خواہ ہم مبدء الٰہی پر ایمان لائیں یا نہ لائیں کیونکہ انجام آزادی کے مسئلہ میں یہ موثر نہیں ہے۔ یعنی خواہ انسان کا نظریہ ہو کہ کائنات کا نظام اسباب و مسببات سب اللہ کے ارادہ و مشیئت سے وابستہ ہے یا اس کا نظریہ ہو کہ یہ نظام کائنات مستقل ہے خدا سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے دونوں صورت میں عقیدہ جبر قضا و قدر کا نتیجہ نہیں ہے۔ خلاصۂ مقصود یہ ہے کہ ہر حادثہ کا رابطہ اپنی علتوں سے اٹوٹ ہے۔ اور منجملہ علتوں کے خود انسان کا اختیار و ارادہ ہے نہ کہ سبب و مسبب کا انکار۔

قضا و قدر الٰہی ہر ظاہر ہونے والی چیز کو اس کے خاص مجریٰ علت سے پیدا کرتا ہے اور ایک قانون عام کی طرح خدا کی مشیت پورے عالم پر چھائی ہوئی ہے اور ہر تغیر بھی سنت الٰہی کے بنیاد پر ہے اور اس کے علاوہ کسی صورت میں قضا و قدر کا تحقق نہیں ہوگا اور جو بھی علمی نظریہ اصل علیت عمومی کو قبول کرتا ہے وہ اس قسم کے روابط کو قبول کرنے پر مجبور ہے چاہے مکتب الٰہی کا پیرو ہو یا مکتب مادی کا پیرو ہو۔

اب اگر کسی بھی حادثہ کا ظہور ـــ اسمیں افعال انسان بھی شامل ہیں ـــ علل و اسباب کی بنا پر قطعی ہو جائے اور یہ ضرورت قطعی مفید جبر ہو تو پھر دونوں مذہبوں کا نتیجہ جبر ہوگا اور اگر ضرورت حوادث کا قطعی ہونا مفید جبر نہیں ہے تو الٰہی مکتب اور مادی مکتب میں کیا فرق ہے؟

ہاں جو تفاوت ثابت ہے وہ یہ ہے کہ دینی تصور کا خیال ہے کہ یہاں پر معنوی امور کا ایک سلسلہ ہے جو ان عوامل کا جزء ہے جو بہت سے حوادث کی پیدائش میں بہت موثر ہیں۔ یہ دینی تصور یہ بھی کہتا ہے کہ وجود میں کچھ ایسے معنوی اسرار و رموز ہیں جو عوامل مادی سے کہیں زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہیں۔ یہ دینی تصور زندگی کو روح، مقصد، معنی عطا کرتا ہے اور انسان کو نشاط، قوت فکر، بصیرت کی گہرائی افق میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اور انسان کو ہولناک ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے روکتا ہے اور

بغیر توقف و رکود کے انسانی سیر کو کمال کی طرف پہونچاتا ہے۔ یہ باتیں مادی تصور میں نہیں پائی جاتیں۔

بنابریں ایک فرد الٰہی کہ جو بطور رسا قضا و قدر کا معتقد ہے اور اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ انسان و جہان کی خلقت میں حکیمانہ مقاصد مضمر ہیں اسی اعتماد و توکل کے ساتھ جو صراط مستقیم طے کرنے میں خدا پر رکھتا ہے اور اپنے کاموں میں اسکی حمایت و پشتیبانی پر بھروسہ رکھتا ہے وہ شخص اپنے فعالیت کے ثمرات و نتائج کا زیادہ اور مطمئن تر ہو کر امیدوار رہتا ہے۔

لیکن جو شخص جہان مادی کے تار پود میں گرفتار ہے۔ اور مخصوص تفکر کے دائرے میں مادی قضا و قدر کی طرف میلان رکھتا ہے وہ اس عزت سے برخوردار نہیں ہے۔ کیونکہ اسے اپنے امانوں کی تکمیل پر اطمینان نہیں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں نظریوں میں تربیتی، اجتماعی، روحانی لحاظ سے بہت عمیق فاصلہ موجود ہے۔

اناطول فرانس (ANATOLE FRANCE) کہتا ہے: یہ دنیا کی قدرت و نیکوکاری ہے جو انسان کو اعمال میں عواقب و اسبابیت کی تعلیم دیتی ہے۔ اور جس وقت ہم قضائے الٰہی کے فلسفہ کے اصول سے دستبردار ہو جائیں گے — جیسا کہ ہم آجکل منکر علم و حریت میں ہیں — تو ہمارے پاس کوئی دوسرا ایسا وسیلہ نہیں رہ جائیگا جس سے ہم کو معلوم ہو کہ ہم دنیا میں کیوں آتے ہیں؟ اور کس مقصد کے لئے اس جہان میں قدم رکھا ہے؟

راز سرنوشت ہم کو اپنے طاقتور اسرار میں گھیرے ہوئے ہے۔ اور واقعی ہم کو کسی چیز میں غور و فکر نہیں کرنا چاہئے تاکہ غم انگیز زندگی کے ابہام کا احساس ہی نہ کر سکیں اور ہمارے رنج و غم کی جڑیں ہمارے اسی جہل مطلق کی وجہ سے ہیں کہ ہم کو اس زندگی میں اپنے وجود کی علت بھی معلوم نہیں ہے۔

اگر ہم جسمانی و روحانی تکالیف اور رنج و احساس کے شکنجوں کے فلسفہ کو سمجھ لیں

اور ایک مشیت الٰہی کا اعتقاد کرلیں تو ان شدائد کو برداشت کرلیں گے۔

مومن شکنجوں اور اپنے روحانی عذاب سے بھی لذت کا احساس کرتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مومن سے جو گناہ و خطا سرزد ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے مایوس نہیں ہوتا۔ لیکن جس دنیا میں شعلۂ ایمان بالکل بجھ چکا ہے وہاں درد، مرض حتی کہ اپنے کو بھی ہار بیٹھا ہے اور سوائے بے تکی شوخیوں اور مسخرہ پن کے وہاں کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

قضا و قدر کی ناقص تفسیر

کچھ نوزائیدہ مشفق حضرات قضا و قدر کے بارے میں غلط تصور کی وجہ سے کہتے ہیں، قدر کا عقیدہ انسان میں جمود و رکود پیدا کرتا ہے اور انسان کو زندگی میں کسی بھی کوشش اور عمل سے مانع ہوتا ہے۔

مغربی دنیا میں اس تخیل کے عام ہونے کی وجہ مسئلہ قضا و قدر کا صحیح مفہوم نہ جاننا ہے اور خصوصاً اسلامی تعلیم کے منبع سے عدم واقفیت ہے۔ اور اس غلط مغربی تصور کا مشرقی لوگوں میں پھیلنے کی علت یہ ہے کہ مشرق ابھی مغرب سے پیچھے ہے۔ ہر وہ شخص یا قوم جو اپنے مادی و معنوی خواہشات تک نہیں پہنچ پاتی وہ دل کو بہلانے کے لئے بخت، مقدر، اتفاق، توفیق، قضا، قدر جیسے الفاظ کا سہارا لیتی ہے۔ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے: میری امت اور میرے ماننے والوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ وہ گناہ و تباہ کاری کے مرتکب ہوں گے اور فساد کی توجیہ کے لئے کہیں گے قضا و قدر الٰہی کا تقاضا یہی تھا ـــــ ہم کیا کریں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے یہ سب مقدر کا کھیل ہے (مترجم) ـــــ اگر اس قسم کے لوگوں سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو ان سے کہہ دیں ان سے بیزار ہوں۔

زندگی میں انسان کو حصول مقصد کے لئے قضا و قدر اس کے سعی پیہم سے کبھی نہیں روک سکتی۔ بلکہ جو لوگ اس مسئلہ میں ضروری دینی فکر سے مطلع ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ مادی و معنوی کے ساتھ ساتھ حیات مادی کی تنظیم میں اپنی ضرورت سے زیادہ کوشش صرف کریں یہ ایک ایسی دعوت ہے جو انسان کی کوششوں میں سرعت پیدا کرنے کے لئے موثر ہے۔

مغربی مفکرین میں سے جن لوگوں نے قضا و قدر کی ناقص تفسیر کی ہے۔ ان میں ایک جان پول سارتر (Jean Paul Sartre) ہیں چنانچہ ان کا تصور یہ ہے: قضا و قدر الٰہی کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ انسان کا اپنے افعال و اعمال میں حریت و اختیار کا عقیدہ نہیں مانا جا سکتا۔ ان دونوں میں سے ایک ہی عقیدہ کو مانا جا سکتا ہے۔ یا تو خدا اور اسکی قضا و قدر اور یا پھر انسان کی حریت و اختیار! چنانچہ وہ کہتا ہے: میں چونکہ انسان کی حریت کا قائل ہوں اس لئے خدا پر عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اگر میں خدا پر عقیدہ رکھوں تو اسکی قضا و قدر پر بھی عقیدہ رکھنا ہوگا اور اگر قضا و قدر کو مان لوں تو انسان کی حریت سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا۔ لیکن چونکہ میں حریت انسان کا عقیدہ رکھتا ہوں لہذا خدا پر ایمان نہیں رکھ سکتا:

حالانکہ خداوند عالم کی قضا و قدر عام ہے ایک طرف سے اور انسان کی آزادی و حریت سے دوسری طرف سے کوئی منافات نہیں ہے۔ قرآن مجید جو مشیت الٰہی کو عام جانتا ہے اسی کے ساتھ انسان کی آزادی کا قائل ہے اسی کو خودسازی پر آگاہ و توانا دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اچھے برے کی شناخت، زشت و زیبا کی پہچان اور ان میں سے ایک کو اختیار کرنا یہ خود انسان کا کام ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (الدھر/۳)

ہم نے انسان کو راستہ بھی دکھایا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا

دوسری جگہ ہے:-

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا (الاسراء/۱۹)

اور جو لوگ آخرت کے متمنی ہوں اور اس کے لئے جیسی چاہئے ویسی کوشش بھی کریں اور وہ ایمان دار بھی ہوں تو یہی لوگ وہ ہیں جن کی کوشش

مقبول ہوگی۔

اور جو لوگ قیامت میں یہ کہیں گے ان کی ملامت کرتا ہے:۔

لَوْ شَاءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا
حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ (النحل/۳۴)

اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی اس کے سوا کسی اور چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم بغیر اس (کی مرضی) کے کسی چیز کو حرام کر بیٹھتے۔

قرآن کی کسی بھی آیت میں فساد و ضلال کی نسبت یا اصلاح کے مخالفت کی نسبت قضائے الٰہی کی طرف نہیں ہے۔ کوئی ایسی آیت آپ کو نہیں ملے گی جس میں ارادۂ انسان کی جگہ اللہ کے ارادہ کو دخل دیا گیا ہو۔ اور نہ کہیں یہ ملے گا کہ قرآن کہہ رہا ہو کسی فرد یا افراد کو اس لئے قتل کیا گیا ہے کہ قضائے الٰہی کا تقاضا یہی تھا۔ البتہ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ فلاں کو غضب خدا گھیرے گا یا سرکشوں کو خدا عذاب الیم دے گا۔

اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ لاتعد ولاتحصیٰ نعمتوں کا انعام کیا ہے لہٰذا اگر ان میں سے کوئی طریق صلاح و طہارت کی طرف پلٹے تو وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ واپسی کا راستہ کھول دیتا ہے اور توبہ قبول کر لیتا ہے اور یہ بہت بڑی رحمت ہے۔

انسان کے ارادہ و اختیار کا دائرہ اگرچہ جملہ حیوانات سے وسیع ہے مگر پھر بھی اسی دائرہ کے اندر ہے جو خدا نے اس کے لئے محدود و معین کر دیا ہے۔ اس لئے اپنی پوری زندگی میں ہر خواہش کو پورا نہیں کر پاتا۔ اسی لئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے لیکن چاہے جتنی بھی کوشش کرے نتیجہ تک نہیں پہونچ پاتا اس کی علت یہ نہیں ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں حائل ہو گیا اور اس کے انجام کار سے مانع ہو گیا۔ بلکہ ایسے مواقع پر کچھ مجہول خارجی عوامل ہوتے ہیں جو انسان کی دانائی اور توانائی کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں وہ انسان کے مقاصد کے راستے میں سدِ راہ بن جاتے ہیں۔

اور اسکی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی علت بغیر معلول کے اور کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہمارے وسائل ادراک بہت ہی محدود و قاصر ہیں تو ہم کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ہم اپنی تمام خواہشات کو پورا بھی نہیں کر سکتے۔

خداوند عالم نے اس نظام وجود میں ملیارڈ عوامل پیدا کئے ہیں۔ بعض تو انسان کیلئے معلوم ہیں مگر کثرت ان عوامل کی ہے جو غیر معلوم ہیں بلکہ ان کا حساب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس معنی کے بناء پر قضا و قدر نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار کو سلب نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی فعالیت اور سعادت بخش زندگی تک پہونچنے سے مانع ہوتے ہیں۔ بلکہ فکر و عمل کیلئے راہنما ہیں اور اپنی کوشش بھر انسان کو حرکت میں لاتے ہیں تاکہ افزائش دانش کی راہ میں اور جتنے بھی دقیق تر عوامل جو زندگی کی کامیابیوں کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں ان کو پہچانیں۔ بس اس قسم کے قضا و قدر پر عقیدہ رکھنا خود انسانی مقاصد کی تکمیل و ترقی کے لئے ایک موثر ہے۔

اس بحث اور گذشتہ بحث کے ضمن میں انسان کی شقاوت و سعادت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کیونکہ شقاوت و سعادت انسان کے افعال اختیاریہ اور حرکات اختیاریہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شقاوت و سعادت نہ تو انسان کے اختیاری اعمال کی صفت بنتی ہیں اور نہ ان عوامل طبیعت کی صفت بنتی ہیں جو وجود انسان میں موثر رول ادا کرتے ہیں۔

یاد رکھئے ماحول اور وراثت اور تمام وہ چیزیں جو انسان میں طبعی طور سے نمو دار ہیں ان میں سے کوئی بھی ہستی انسان کی شقاوت و سعادت میں الزامی اثر نہیں رکھتی۔ یہ چیزیں انسان کے انجام کو معین نہیں کرتیں۔ بلکہ جو چیز انسان کا مستقبل بناتی ہے اور اس کو

ے اس کے معنی پہلے گذر چکے ہیں۔

ترقی یا تنزلی تک پہونچاتی ہے وہ خود انسان کا ذاتی اختیار ہے اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی علمی اور عقلی قدرت سے اور اپنی صلاحیتوں سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

سعادت و خوشبختی کا اس بات سے کوئی علاقہ نہیں ہے کہ انسان مواہب طبیعت سے کس کمیت یا کیفیت میں متمتع ہے۔ بلکہ جس کے ہاتھوں میں فراوان سرمایہ ہے اس کی مسئولیت بھی حساس تر ہے بقول شخصے "ہر کہ بامش بیش برفش بیشتر" اور اس کا انحراف ایک کم درجہ و کم مایہ کے انحراف کے برابر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حساب انھیں امکانات و استعدادات کے مطابق ہوگا جن سے وہ متمتع ہے۔

یہ بات بہت ممکن ہے کہ جس شخص کی ذات میں پوشیدہ توانائی اور ذخیرہ کم ہے اور ظواہر طبیعت کے لحاظ سے قابل توجہ سرمایہ کا مالک بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنی وضع و موقعیت کو اپنی عائد شدہ تکالیف و مسئولیات سے مکمل طور پر تطبیق دیتا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ اس سعادت تک پہونچ جائے جو انسانی مرتبہ و مقام کے لائق و مناسب ہے۔

کیونکہ انسان جس سعادت و کامیابی تک پہونچا ہے وہ اپنے اندر ذخیرہ شدہ صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی وجہ سے ہے۔ ویسے اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ باین معنی کہ مالدار اور ثروت مند سعادت تک نہ پہونچ سکے بلکہ ہوسکتا کہ سوء استفادہ کرکے گمراہ و شقی ہوجائے اور کبھی بھی فلاح یافتہ نہ ہوسکے:۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (المدثر — ۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے۔

قرآن کا نظریہ یہی ہے کہ ہر شخص کی شقاوت یا سعادت اس کے اختیاری امور سے وابستہ ہے۔ ترکیب طبعی و نفسی سے نہیں! اور یہ خداوند عالم کی آیات عدل میں سے ایک آیت ہے۔

بدا بھی شیعوں کے مخصوص عقائد میں سے ہے۔ باین معنی کہ عوامل و اسباب کے

بدلنے سے مقدر بھی بدل جاتا ہے اور جو چیز بحسب ظاہر دائم و قطعی معلوم ہوتی ہے وہ انسان کے اعمال و افعال و سیرت کے بدلنے سے تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ جس طرح مادی عوامل کبھی انسان کے مقدر کو بدل دیتے ہیں اسی طرح موجود یہ عوامل معنوی بھی کبھی کبھی موثر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیزیں پس پردہ ہیں اور مجریٰ ظاہری کے خلاف ہیں یہ معنوی عوامل ان کو ہمارے لئے ظاہر کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیر اسباب و شروط کی وجہ سے کسی نئے امر جدید کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور امر اول کی مصلحت ختم ہوتے ہی امر ثانی کی مصلحت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ نسخ میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح بعد والے قوانین پہلے والے قوانین کو نسخ کر دیتے ہیں اور اس سے خداوند عالم کی جہالت یا ندامت کو نہیں ثابت کیا جا سکتا بلکہ نسخ حکم تشریعی سابق کے ختم ہو جانے کا کاشف ہے بس یہی صورت حکم تکوینی میں بدا کی ہوتی ہے۔

بدا کا یہ مطلب لینا کہ "ایک چیز کی حقیقت خدا پر مخفی تھی اس کے بعد ظاہر ہوئی لہٰذا خدا نے پہلا حکم بدل دیا" بالکل غلط اور اشتباہ ہے۔ ایسا عقیدہ خدا کے علم کے احاطہ کامل کے منافی ہے کوئی بھی مسلمان اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔

دعا بھی ان معنوی عوامل میں سے ہے جس کی اہمیت میں کمی نہیں کرنی چاہئے۔ خداوند عالم ہر شخص کے اندرونی اسرار سے واقف ہے۔ مگر بندے کا عالم روح و معنی میں اپنے رب سے دعا کرنا اور بندہ کا اپنے خدا سے رابطہ بمنزلہ اس نظام عمل کے ہے جو انسان کے طبیعت سے رابطہ و علاقہ میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے دعا خود مستقل ایک عمل کرنیوالی چیز ہے۔

لہٰذا انسان کا فریضہ ہے کہ اگر کبھی مشکلات کے محاصرے میں آ جائے تو دامن یاس و قنوط کو نہ پکڑے۔ کیونکہ رحمت الٰہی کے دروازے کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے آنیوالا کل ایک امر جدید کے کر آئے جس کا انسان تصور بھی نہ کر سکتا

ہو۔ ارشاد خدا ہے :-

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن / ۲۹)

وہ ہر روز (ہر وقت) مخلوق کے ایک نہ ایک کام میں ہے۔

اسی لئے کسی بھی صورت میں دعا سے دست بردار نہیں ہونا چاہئے اور دعا کے ساتھ کوشش بھی بہت ضروری ہے کیونکہ بغیر کوشش کے دعا کے بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر۔ بلکہ انسان کا فریضہ ہے کہ اپنی کوششوں کے ساتھ ساتھ نہایت خلوص و رجاء سے اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کر دے اور قادر مطلق سے امداد و اعانت طلب کرتا رہے۔ اور یہ بات شک سے بالا ہے کہ خدا اپنے مومن بندہ کی مدد کرتا ہے۔ ارشاد ہے :-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (بقرہ/۱۸۵)

(اے رسولؐ) جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو (کہہ دو کہ) میں ان کے پاس ہی ہوں اور جب مجھ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو میں ہر دعا کرنے والے کی دعا (سن لیتا ہوں اور جو مناسب ہو تو) قبول کرتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ میرا بھی کہا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ تاکہ وہ سیدھی راہ پر آجاویں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ دعا اسی صورت میں اوج کمال تک پہونچتی ہے اور انسان کو بحر سعادت میں غرق کر دیتی ہے جب انسان اضطرار و درماندگی کے گڈھے میں گر کر بغیر اپنے کو علل و اسباب سے منقطع کرکے خدا سے وابستہ ہو جاتے۔ تو یہاں پر اپنے کو اپنے خدا کے ساتھ دیکھے گا اور خدا کے لطف و عنایت خاص و بے پایاں کو محسوس کریگا۔

امام سجادؑ دعائے ابو حمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں : خدایا! مطالب کے راستے تیری طرف کھلے پاتا ہوں اور تیری طرف امیدوں کے گھاٹ بھرے دیکھتا ہوں۔ تیرے فضل و کرم سے استعانت ان لوگوں کے لئے جو تجھ سے لو لگاتے ہیں مباح دیکھتا ہوں۔ دعا کے دروازے

صابرین ومظلومین کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں تو امید کرنیوالوں کی دعاکو قبول کرتا ہے اور مظلومین کی مدد کرتا ہے۔

روایت میں ہے: اپنے گناہوں کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد اپنی موت سے مرنیوالوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح روایت میں یہ بھی ہے: احسان کی وجہ سے زندہ رہنے والوں کی تعداد اپنی عمر طبعی کے مطابق زندہ رہنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہے: انسان کی موت گناہوں سے زیادہ ہے بہ نسبت طبعی موت کے اور انسان کی زندگی احسان کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حیات طبعی کے (سفینۃ البحار ج ا ص ۴۸۹)

دعا اور اسکی برکت سے خدا نے جناب زکریا کو یحییٰ عطا کیا اور توبہ وانابت کی وجہ سے جناب یونس بن متی اور ان کی قوم کو عذاب وہلاکت سے نجات دی۔

خداوند عالم نے کائنات میں جن قوانین کا اجراء فرمایا ہے وہ قوانین خدا کی لامحدود توانائیوں کو محدود نہیں کر سکتے اور اسکی قدرت عمومی کو اس سے چھین نہیں سکتے جس طرح خدا ایجاد وخلق پر قادر تھا۔ ان کے تغییر وتبدیل، محو واثبات پر بھی قادر ہے اور اس کے استمرار پر بھی قادر ہے قوانین ومظاہر قدرت کے سامنے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

لیکن بعض ظواہر طبیعت کے ہر وقت تبدیل پر قادر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے نظام عالم میں جو مقررات معین کر دیے ہیں ان کو توڑتا ہی رہے۔ اور قوانین وسنن واصول میں الٹ پلٹ کرتا ہی رہے۔ بلکہ خود یہ تغییر وتبدیل بھی کچھ اصول وقوانین کے تابع ہے جس کو ہم کبھی محسوس ہی نہیں کر سکتے۔